شذرات

قرآن کا موضوع	جاوید احمد غامدی	۲

قرآنیات

النساء (۴: ۱۵-۱۸)	جاوید احمد غامدی	۵

معارف نبوی

حلاوت ایمان	طالب محسن	۹
قرآن کا انکار کرنے پر کسی کو قتل کرنا	معز امجد	۱۵
سمندری جانور اللہ کے ذبح کردہ ہیں	ساجد حمید	۱۹

دین و دانش

ایمانیات (۱۲)	جاوید احمد غامدی	۲۱

نقطۂ نظر

طٰہٰ حسین اور ادب جاہلی	محمد وسیم اختر مفتی	۲۹
چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن'' (۷)	پروفیسر خورشید عالم	۴۰

سیر و سوانح

نبی موعود کی آمد	خالد مسعود	۴۹
عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۲)	محمد وسیم اختر مفتی	۵۷
اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۶ء	نعیم احمد	۶۳

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

قرآن کا موضوع

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قرآن کے بارے میں یہ بات اس کا ایک عام قاری بھی بہت آسانی کے ساتھ جان سکتا ہے کہ اس کا موضوع صرف وہ حقائق ہیں جن کو ماننے اور جن سے پیدا ہونے والے تقاضوں کو پورا کرنے ہی پر انسان کی ابدی فلاح کا انحصار ہے۔ وہ انھی حقائق کو انفس و آفاق اور تاریخ کے دلائل سے ثابت کرتا ہے، بنی آدم کو انھیں ماننے کی دعوت دیتا ہے، ان کو جھٹلا دینے کے نتائج سے انھیں خبردار کرتا ہے اور ان سے جو تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ان کی شرح و وضاحت کرتا ہے۔ ان کے علاوہ کسی چیز سے اسے بحث نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے وہ عالم طبیعی کے بارے میں بھی اگر کچھ کہتا ہے تو اس کا بیان کبھی حقیقت کے خلاف نہیں ہوتا، لیکن اس عالم کے متعلق جو علوم وفنون انسان کی عقل نے دریافت کیے ہیں اور جو وہ آنے والے زمانوں میں دریافت کرے گی، انھیں قرآن مجید کبھی زیر بحث نہیں لاتا۔ اس طرح کی کوئی چیز سرے سے اس کا موضوع ہی نہیں ہے۔

لیکن اسے کیا کہیے کہ اس امت کی تاریخ میں بارہا لوگ اس کتاب کو اس کی اس اصلی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ یہ چونکہ اللہ کی کتاب ہے، اس لیے دنیا کے سارے علوم وفنون اس میں لامحالہ ہونے چاہییں۔ اس کے بعد وہ اپنے اس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے اس بات کے درپے ہوئے کہ کسی طرح ان علوم وفنون کے ماخذ اس کی آیات میں سے ڈھونڈ نکالے جائیں۔ چنانچہ زبان و بیان اور نظم کلام کی ہر دلالت کو نظر انداز کر کے کبھی فلسفۂ یونان کے اوہام اس سے ثابت کیے گئے، کبھی ایک خاص زمانے کی سائنسی معلومات کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ وہ درحقیقت اس کی فلاں اور فلاں آیت سے اخذ کی

گئی ہیں، کبھی علم طب اور نجوم وفلکیات کے بعض عقائد اس سے برآمد کیے گئے، اور کبھی انسان کے ایٹم بم بنانے اور چاند پر پہنچنے کا ذکر اس میں سے نکال کر دکھایا گیا۔

یہ ساری زحمت لوگوں کو صرف اس لیے اٹھانا پڑی کہ انھوں نے اس کتاب کے بارے میں بالکل غلط تصور قائم کر لیا۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھے کہ عالم کے پروردگار نے اس کتاب سے پہلے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ جس طرح یہ کتاب پروردگار کی عنایت ہے، اسی طرح عقل بھی اسی کی عنایت ہے۔ چنانچہ جن معاملات میں عقل کی رہنمائی اس کے لیے کافی ہے، ان سے اس کتاب کو کوئی تعلق نہیں اور جن سے یہ کتاب بحث کرتی ہے، ان میں عقل اگر اپنے وجود ہی سے غافل نہ ہو جائے تو اس کی رہنمائی سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

یہ صرف قرآن مجید ہی کا معاملہ نہیں ہے، اللہ کے نبی نے اپنے بارے میں بھی یہ حقیقت اپنے ماننے والوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھائی ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کھجوروں میں گابھا دیتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اس کے بغیر ہی ٹھیک ہے۔ انھوں نے اس سال گابھا نہیں دیا۔ چنانچہ پھل بہت ردی آیا۔ لوگوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: تم اس طرح کے معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ میں تمھیں اللہ کا دین بتانے آیا ہوں، اس لیے میری طرف صرف اسی کے لیے رجوع کیا کرو۔

ہم اگر قرآن مجید سے فی الواقع ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اس کی طرف صرف دین کے حقائق و معارف جاننے کے لیے رجوع کریں۔ اپنے سونے کے لیے چارپائی بنانے اور اپنی آواز زہرہ و مریخ تک پہنچانے کے لیے ہمیں اپنی عقل کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے انسان کو اپنے دائرۂ عمل میں کبھی مایوس نہیں کیا۔

قرآن مجید ہم کو یہ بتانے کے لیے نازل کیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی رضا ہم اس دنیا میں کن چیزوں کو مان کر اور کن چیزوں پر عمل کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کی آیات میں اپنی خواہشوں کا مضمون پڑھنے کے بجائے اپنی خواہشوں کو اس کی پیروی کے لیے مجبور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات قرآن میں جگہ جگہ واضح کی ہے کہ اس سے ہدایت حاصل کرنے کی پہلی شرط یہی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص دنیا کے سارے علوم و فنون اسی ایک کتاب میں دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو، لیکن اس کی یہ خواہش اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی کہ اس میں صرف اس علم کا بیان ہے جو انسان کی ابدی فلاح کے لیے ضروری ہے۔

[۱۹۸۷ء]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ، فَاسۡتَشۡھِدُوۡا عَلَیۡھِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ، فَاِنۡ شَھِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡھُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ، حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الۡمَوۡتُ، اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾

اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں[۳۴]، اُن پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو[۳۵]۔ پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو انھیں گھروں میں بند کر دو، یہاں تک کہ اُن کی موت آ جائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راستہ نکال دے[۳۶]۔ ۱۵

---

[۳۴] اصل الفاظ ہیں: 'والّٰتی یاتین الفاحشۃ'۔ ان میں 'الفاحشۃ' سے مراد زنا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اس معنی کے لیے معروف ہے۔ اس کے ساتھ جو فعل اس جملے میں آیا ہے، وہ بیان مداومت کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ قحبہ عورتوں کا ذکر ہے۔ اس صورت میں اصل مسئلہ چونکہ عورت ہی کا ہوتا ہے، اس لیے مرد زیر بحث نہیں آئے۔

[۳۵] یعنی اس بات کے گواہ کہ یہ فی الواقع زنا کی عادی قحبہ عورتیں ہیں۔ سورۂ نور میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی یہ شرط اسی طرح برقرار رکھی ہے۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ، فَاٰذُوْهُمَا، فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ، ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ، فَاُولٰٓئِكَ

اور جو مرد و عورت تمھارے لوگوں میں سے اس جرم کا ارتکاب کریں[۳۷]، اُنھیں ایذا دو[۳۸]۔ پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کر لیں[۳۹] تو اُن سے درگزر کرو۔ بے شک، اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۶

(یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ) اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں[۴۰]، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، وہی ہیں جن

[۳۶] اس سے واضح ہے کہ یہ ایک عارضی حکم تھا۔ چنانچہ اس میں جس راہ نکالنے کا ذکر ہے، وہ بعد میں اس طرح نکلی کہ قحبہ ہونے کی وجہ سے ان عورتوں کو زنا اور فساد فی الارض، دونوں کا مجرم قرار دیا گیا اور ان جرائم کی جو سزائیں سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۲ اور سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۳۳ میں بیان ہوئی ہیں، وہ بعض روایتوں کے مطابق ان پر نافذ کرنے کی ہدایت کی گئی۔

[۳۷] یہ زنا کے عام مجرموں کا ذکر ہے جو بالعموم یاری آشنائی کے نتیجے میں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس میں زانی اور زانیہ، دونوں چونکہ متعین ہوتے ہیں، اس لیے دونوں کا ذکر ہوا ہے اور مذکر کے صیغے زبان کے عام قاعدے کے مطابق شریک غالب کے لحاظ سے آئے ہیں۔

[۳۸] یہی ایذا ہے جو بعد میں سو کوڑوں کی صورت میں متعین کر دی گئی۔ یہ اس جرم کی انتہائی سزا ہے اور صرف انھی مجرموں کو دی جاتی ہے جن سے جرم بالکل آخری درجے میں سرزد ہو جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔

[۳۹] اس سے معلوم ہوا کہ رویے کی اصلاح توبہ کے لازمی شرائط میں سے ہے۔ اگر کوئی شخص برائی سے باز نہیں آتا تو زبان سے توبہ توبہ کا ورد کر لینے سے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی، بلکہ الٹا خدا کی ناراضی کا باعث بن سکتی ہے۔

[۴۰] اصل میں لفظ 'جھالۃ' استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی اگرچہ نہ جاننے کے بھی آتے ہیں، لیکن اس کا غالب

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيُهِمُ، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيُمًا حَكِيُمًا ﴿١٧﴾ وَلَيُسَتِ التَّوُبَةُ لِلَّذِيُنَ
يَعُمَلُوُنَ السَّيِّاتِ، حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الُمَوُتُ، قَالَ: اِنِّىُ تُبُتُ الُئٰنَ،
وَلَا الَّذِيُنَ يَمُوُتُوُنَ، وَهُمُ كُفَّارٌ، اُولٰٓئِكَ اَعُتَدُنَا لَهُمُ عَذَابًا اَلِيُمًا ﴿١٨﴾

کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اُن لوگوں کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے جو گناہ کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آ جاتا ہے، اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔ (اِسی طرح) اُن کے لیے بھی توبہ نہیں ہے جو مرتے دم تک منکر ہی رہیں۔ یہی تو ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے[۴۱]۔ ۱۷-۱۸

استعمال جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی شرارت یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں یہ لفظ عام طور پر علم کے بجائے حلم کے ضد کے طور پر آتا ہے۔ یہاں بھی قرینہ دلیل ہے کہ یہ اسی معنی میں آیا ہے۔

[۴۱] توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کی یہ دو صورتیں قرآن نے بالکل متعین کر دی ہیں۔ اس کے بعد صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی شخص گناہ کے بعد جلد ہی توبہ کر لینے کی سعادت تو حاصل نہیں کر سکا، لیکن اس نے اتنی دیر بھی نہیں کی کہ موت کا وقت آ پہنچا ہو۔ اس صورت کے بارے میں قرآن خاموش ہے اور استاذ امام کے الفاظ میں، یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے، اسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن حکیم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ خوف و رجا کے درمیان ہی رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود ذہن کبھی کبھی اس طرف جاتا ہے کہ اس امت کے اس طرح کے لوگ، امید ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے، اس لیے کہ ان کے بارے میں شفاعت کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

حلاوت ایمان

(مسلم، رقم ۴۳)

عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: ثَلَاثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ بِھِنَّ حَلَاوَۃُ الإِیْمَانِ: مَنْ کَانَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ أَحَبُّ إِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا وَأَنْ یُحِبَّ الْمَرْءَ لَایُحِبُّہُ إِلَّا لِلّٰہِ وأَنْ یَکْرَہَ أَنْ یَعُوْدَ فِیْ الْکُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَہُ اللّٰہُ مِنْہُ کَمَا یَکْرَہُ أَنْ یُقْذَفَ فِی النَّارِ.

”حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں جس آدمی میں ہوں گی، وہ ان سے ایمان کی حلاوت پالے گا۔ایک وہ جسے اللہ اوراس کے رسول ان کے سوا ہر چیز سے محبوب ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی آدمی سے اللہ ہی کی خاطر محبت کرے۔تیسرے یہ کہ وہ کفر میں لوٹنے کو اسی طرح ناپسند کرے جس طرح وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے، جبکہ اللہ نے اسے آگ سے نکال دیا ہے۔“

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ثَلَاثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ طَعْمُ الإِیْمَانِ: مَنْ کَانَ یُحِبُّ الْمَرْءَ لَایُحِبُّ إِلَّا لِلّٰہِ. مَنْ کَانَ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبُّ إِلَيُهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنُ كَانَ أَنُ يُلُقَى فِي النَّارِ أَحَبُّ إِلَيُهِ مِنُ أَنُ يَرُجِعَ فِي الُكُفُرِ بَعُدَ أَنُ أَنُقَذَهُ اللّٰهُ مِنُهُ.

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں جس آدمی میں ہوں گی، وہ ایمان کا ذائقہ پالے گا۔ وہ جو کسی آدمی سے اللہ ہی کی خاطر محبت کرے۔ وہ جسے اللہ اور اس کے رسول ان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں۔ وہ جسے آگ میں ڈال دیا جانا کفر میں لوٹنے سے زیادہ پسند ہو، جبکہ اللہ نے اسے آگ سے نجات دی ہے۔''

عَنُ أَنَسٍ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلىَّ اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ بِنَحُوِ حَدِيُثِهِمُ غَيُرَ أَنَّهُ قَالَ مِنُ أَنُ يَرُجِعَ يَهُودِياً أَوُ نَصُرَانِياً.

''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث اس فرق کے ساتھ بھی بیان کی ہے کہ اس میں 'یرجع فی الکفر' (وہ کفر میں لوٹ جائے) کے بجائے 'یرجع یھودیا أو نصرانیا' (وہ یہودی یا نصرانی ہو جائے) کے الفاظ آئے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لغوی مباحث

ثلاث: 'ثلاث من کن فیہ' میں 'ثلاث' مبتدا ہے اور باقی جملہ اس کی خبر ہے۔ مبتدا عام طور پر معرفہ ہوتا ہے۔ اگر تخصیص کا کوئی پہلو موجود ہو تو نکرہ بھی مبتدا ہو سکتا ہے۔ اس تخصیص کی متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نکرہ کا مضاف الیہ حذف ہو۔ جیسے یہاں 'خصال' محذوف ہے۔

حلاوۃ الإیمان: 'حلاوۃ' کے لغوی معنی مٹھاس کے ہیں۔ مٹھاس اصل میں ایک حسی شے ہے، جیسے گڑ یا شہد کی مٹھاس۔ ایمان کے ساتھ حلاوت کے استعمال سے اس کا دل و دماغ کے لیے مرغوب ہونے کا پہلو واضح ہوتا ہے۔

طعم الإیمان: 'طعم' کا لفظ اردو کے لفظ ذائقہ کا مترادف ہے۔ یہاں 'طعم الإیمان' سے ایمان کی لذتیں مراد ہیں۔ جس طرح مادی چیزوں میں مرغوبات ہوتی ہیں، اسی طرح معنوی چیزوں میں بھی مرغوبات ہوتی

ہیں۔ یہاں یہ تعبیر ایمان کی اسی مرغوبیت کو پیش نظر رکھ کر اختیار کی گئی ہے۔

معنی

اس روایت میں حلاوت ایمان پا لینے کے تین باطنی مظاہر بیان کیے گئے ہیں۔ایک یہ کہ ہماری کسی بھی آدمی سے محبت صرف اللہ کی خاطر ہو۔ دوسرا یہ کہ ہمیں اللہ اور اس کے رسول دوسری ہر چیز اور ہر تعلق سے زیادہ محبوب ہوں۔ تیسرے یہ کہ کفر میں لوٹ جانا ہمیں آگ میں پڑنے سے بھی زیادہ اذیت ناک لگنے لگے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت میں مرکزی بات ایک ہی ہے، یعنی یہ کہ ایک مسلمان کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ عزیز ہوں۔

ایک مسلمان سے جو کردار مطلوب ہے، اس کے دو پہلو اس روایت میں نمایاں کیے گئے ہیں۔ایک یہ کہ وہ ایمان کے ساتھ غایت درجہ وابستہ ہو۔اس کے یقین نے اسے ایک نفس مطمئن بنا دیا ہو۔اس کے دل میں اپنے ایمان کے بارے میں کوئی شائبۂ شک راہ نہ پاتا ہو۔ معلوم ہو کہ اس کا ایمان اور وہ ایک ہی شے ہیں۔ایمان سے محرومی اس کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک لگنے لگے کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے۔ یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک وہ مرکزی بات موجود نہ ہو جسے اللہ اور اس کے رسول کے سب سے زیادہ عزیز ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح دوسری چیز انسان کا اپنے ماحول سے تعلق ہے۔ یہ تعلق مختلف جہتوں سے وجود میں آتا ہے۔ دوست، کاروبار کے ساتھی، ہمسایے، رشتہ دار، بہن بھائی، والدین اور اولاد کے ساتھ آدمی فطری طور پر وابستہ ہوتا ہے۔ یہ وابستگی کم و بیش بھی ہوتی رہتی ہے۔ عام طور پر اس کا باعث کچھ شکایتیں ہوتی ہیں۔ یہ شکایتیں بالعموم توقعات کے پورا نہ ہونے یا برتاؤ میں فرق پر مبنی ہوتی ہیں۔اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ یہ کمی بیشی بھی خدا کے تعلق سے وابستہ رہنی چاہیے۔ مراد یہ کہ افراد تعلق کی عنایتیں اور مہربانیاں اور ان کی زیادتیاں اور بے مہریاں، جب تعلق کی کمی بیشی پر اثر انداز ہونے لگیں تو خدا کے ساتھ ہمارا تعلق اس کیفیت کو تبدیل کر دے اور ہمارا فیصلہ وہی ہو جو اس طرح کے مواقع پر ہمارا خدا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ چیز بھی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک ہم ہر تعلق سے زیادہ خدا سے تعلق کو اہمیت نہ دیتے ہوں۔

خدا سے سب سے بڑھ کر محبت دین کا تقاضا ہے۔ یہ بات بعینہٖ قرآن مجید میں بھی بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے: 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ' (اور جو ایمان والے ہیں، وہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والے

ہیں)۔سورۂ توبہ میں دین سے وابستگی کے ایک تقاضے کو پورا نہ کرنے والوں کو تنبیہ فرمائی ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ آبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ. (۹:۲۴)

''ان سے کہہ دو کہ تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا ہے، وہ تجارت جس کے مندے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمھیں پسند ہیں، اگر تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔ اور اللہ بدعہدوں کو بامراد نہیں کرتا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس آیۂ کریمہ میں ہر اس چیز کو گن کر نمایاں کیا گیا ہے جو خدا اور اس کے رسول کے ساتھ وابستگی کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے اور بات اس نکتے پر ختم کی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اور دین کی نصرت کو ان سب سے بڑھ کر عزیز ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اہل ایمان کے دلوں میں ایمان کو کیا حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ سورۂ حجرات میں ارشاد ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ. (۴۹:۷)

''لیکن اللہ نے تمھارے سامنے ایمان کو محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں کھبایا اور کفر و فسق اور نافرمانی کو تمھاری نگاہوں میں مبغوض کیا۔ یہی لوگ راہ راست پانے والے ہیں۔''

اس محبت سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سب علائق پر اللہ اور اس کے رسول کے حق کو فائق رکھا جائے اور آدمی کسی صورت میں بھی اللہ کی ناراضی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت آدمی کو آپ کے اسوہ کی پیروی کرنے والا بنائے تو یہ ایک امتی کی اپنے رسول سے محبت ہے۔ اور اگر اس محبت کا اظہار صرف زبان تک محدود ہے تو خطرہ ہے کہ روز قیامت اس محبت کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔

متون

امام مسلم نے اس روایت کے تین متن منتخب کیے ہیں۔ یہ تینوں متن 'ثلاث' کے لفظ سے شروع ہوئے ہیں۔

لیکن دوسری کتب حدیث میں اس روایت کے ایسے متون بھی روایت ہوئے ہیں جن میں اس روایت کا آغاز مختلف جملوں سے ہوا ہے۔ مثلاً، بعض متون کا آغاز 'من سره أن يجد طعم الإيمان'، بعض کا 'لا يؤمن أحدكم'، بعض کا 'لا يجد أحدكم حلاوة الإيمان' اور بعض کا 'من أحب أن يجد حلاوة الإيمان' کے جملے سے ہوا ہے۔ ایک متن کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات 'ما الإيمان؟' کے جواب میں ارشاد فرمائی تھی۔ جس طرح مسلم کے متون سے معلوم ہوتا ہے کہ 'حلاوة' کی جگہ پر 'طعم' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں 'الإيمان' کے بجائے 'الإسلام' اور 'وجد' فعل کے لیے 'ذاق' بھی استعمال ہوا ہے۔ جس ترتیب سے ان روایات میں ایمان کے ثمرات بیان ہوئے ہیں، کچھ متون میں ترتیب مختلف ہے اور بعض میں بعض اجزا نقل نہیں ہوئے۔ زیر بحث روایات میں 'المرء' کا لفظ آیا ہے۔ کچھ روایات میں اس کی جگہ 'عبد' اور بعض میں 'غير ذي نسب' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ 'غير ذي نسب' کے الفاظ راوی کا اپنا فہم ہیں۔ آخری جملے کے اختلافات بھی اسی طرح لفظی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً، مسلم ہی کی روایات دیکھ لیں۔ ایک روایت میں 'يلقى' اور دوسری میں 'يقذف' آیا ہے۔ اسی طرح 'يرجع في الكفر' کی جگہ 'يرجع يهوديا و نصرانيا' آیا ہے۔ ایک دوسری کتاب میں آگ کا ذکر قدرے مختلف طریقے سے ہوا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں: 'أن توقد نار عظيمة فيقع فيها أحب اليه من أن يشرك'۔ ان الفاظ میں کفر کی جگہ شرک نے لے لی ہے۔ اسی طرح اس روایت کے فعل 'انقذ' کی جگہ بعض روایات میں 'أنجى' کا فعل بھی نقل ہوا ہے۔ ان متون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کئی اسالیب میں اور مختلف مواقع پر فرمائی تھی۔ مسند الشامیین میں اسی نوع کی ایک گفتگو ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

عن أبي رزين العقيلي قال: قلت يارسول الله، كيف يحيي الله الموتى؟ قال: بأرض من أرضك مجدبة، ثم مررت بها مخصبة. قال: نعم. قال: كذلك النشور. قال: يارسول الله، ما الإيمان؟ قال: تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله وأن يكون الله ورسوله أحب إليك مما سواهما	''حضرت ابورزین عقیلی بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یارسول اللہ، اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کریں گے؟ آپ نے فرمایا: (کیا ایسا نہیں ہوتا کہ) تمھارے علاقوں میں کوئی علاقہ (تم گزرتے ہو تو) روئیدگی سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ پھر تم اس میں سے گزرتے ہو تو سرسبز ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: قیامت میں اٹھنا اسی طرح ہوگا۔ پھر پوچھا: یا رسول اللہ، ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تو اس بات

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

وأن تحرق بالنار أحب إليك أن تشرك بـالله وأن تـحب غير ذی نسب تحبه إلا لله. فـإذا كـنـت كذلك فقد دخل حـب الإيـمان قلبك، كما دخل حب الـمـاء قلب الضمآن فی اليوم القائظ . قـلـت: يـا رسول الله، كيف لی بـأن أعـلـم أنـی مـؤمـن؟ قـال: ما من هذه الأمة مـن عبـد يـعمل حسنة يری أنها حسنة، ولا يعمل سيئة يستغفر الله إلا هو مؤمن. (رقم ۶۰۲)

کا برملا اعلان کرے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول تمھیں ان کے سوا ہر چیز سے زیادہ پسند ہوں۔ یہ کہ تمھیں آگ سے جلا دیا جائے اس سے بہتر لگے کہ تم شرک کرو۔ جب تمھارا حال یہ ہو تو (سمجھ لو کہ) ایمان کی محبت تمھارے دل میں داخل ہو گئی ہے، ایسے ہی جیسے سخت گرم دن میں پیاسے کے دل میں پانی کی محبت داخل ہو جاتی ہے۔ (اگلا) سوال کیا: میرے لیے کیسے ممکن ہے کہ میں یہ جان لوں کہ میں مومن ہوں؟ آپ نے فرمایا: اس امت کا کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جو نیکی کا عمل کرتا ہو اور اسے وہ ایک نیکی سمجھتا ہو اور اسی طرح وہ برائی کرتا ہو اور اللہ سے اس پر معافی مانگتا ہو، مگر یہ کہ وہ مومن ہو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کتابیات

بخاری، رقم ۱۶، ۲۱، ۵۶۹۴، ۶۵۴۲۔ مسلم، رقم ۴۳۔ نسائی، رقم ۴۹۸۷، ۴۹۸۸، ۴۹۸۹۔ ترمذی، رقم ۲۶۲۴۔ ابن ماجہ، رقم ۴۰۳۳۔ احمد، رقم ۹۵۴۷، ۱۰۷۴۹، ۱۲۰۲۱، ۱۲۷۸۸، ۱۲۸۰۶، ۱۳۴۳۱، ۱۳۱۷۴، ۱۳۶۱۷، ۱۳۹۰۲، ۱۳۹۴۰، ۱۳۹۹۱، ۱۴۱۰۲۔ ابن حبان، رقم ۲۳۷، ۲۳۸۔ حاکم، رقم ۳، ۳۱۲۷۔ بیہقی، رقم ۲۰۸۵۲۔ ابو یعلیٰ، رقم ۲۸۱۳، ۳۰۰۰، ۳۱۴۲، ۳۲۵۶، ۳۲۵۹۔ سنن کبریٰ، رقم ۱۱۷۱۸، ۱۱۷۱۹، ۱۱۷۲۰۔ ابن شیبہ، رقم ۳۴۷۶۵، ۳۰۳۶۰۔

معز امجد

قرآن کا انکار کرنے پر کسی کو قتل کرنا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روایت کا مضمون

ابن ماجہ، رقم ۲۵۳۹ کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من جحد آية من القرآن فقد حل ضرب عنقه ومن قال لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأن محمدا عبده ورسوله فلا سبيل لأحد عليه إلا أن يصيب حدا فيقام عليه.

''جس نے قرآن کی کسی ایک آیت کو بھی جھٹلایا تو اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور جس نے یہ اعلان کیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں تو اس کے خلاف کسی کو اقدام کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ہاں، البتہ اگر وہ خدا کی مقرر کردہ کسی حد کو توڑے تو اس کے خلاف اقدام کیا جا سکتا ہے۔''

روایت پر تبصرہ

یہ روایت صرف ابن ماجہ نے نقل کی ہے اور اس کی ایک ہی سند ہے۔ اس روایت کی سند میں الحکم بن ابان اور حفص بن عمر شامل ہیں۔

عقیلی نے حکم بن ابان کو ضعیف قرار دیا ہے[1] اور اس کے بارے میں ابن حجر کی رائے یہ ہے کہ:

وذكره بن حبان فی الثقات وقال ربما أخطأ. (تہذیب التہذیب ۲/۳۶۴)

''ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے، تاہم یہ کہا ہے کہ بعض اوقات وہ غلطی کرتا ہے۔''

وقال بن عدی فی ترجمة حسین بن عیسٰی الحكم بن أبان فيه ضعف. (تہذیب التہذیب ۲/۳۶۴)

''ابن عدی نے حسین بن عیسیٰ کی سوانح میں لکھا ہے کہ الحکم بن ابان میں ایک طرح کا ضعف پایا جاتا ہے۔''

ابن حجر اپنی کتاب ''تقریب التہذیب'' میں لکھتے ہیں:

الحكم بن أبان العدنی أبو عیسٰی صدوق عابد وله أوهام. (تقریب التہذیب ۱/۱۷۴)

''ابو عیسیٰ حکم بن ابان عدنی سچا اور عابد ہے، تاہم وہ وہم پیدا کر دیتا ہے۔''

جہاں تک حفص بن عمر کا معاملہ ہے تو اکثر اہل علم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن ابی حاتم اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

كان ممن يقلب الأسانيد قلبا لا يجوز الاحتجاج به إذا انفرد. (المجروحین ۱/۲۵۷)

''یہ ان لوگوں میں سے ہے جو سند کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ جب یہ کسی روایت کو نقل کرنے میں منفرد ہو تو اس روایت کو دلیل نہیں بنایا جائے گا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ایک اور موقع پر ابن ابی حاتم لکھتے ہیں:

...روى هذا عن الحكم بن أبان حفص بن عمر العدنی وخالد بن يزيد العمری وهما ضعيفان واهيان أيضا. (المجروحین ۱/۱۱۴)

''...اس روایت کو حکم بن ابان سے حفص بن عمر عدنی اور خالد بن یزید عمری نے روایت کیا ہے اور وہ دونوں نہایت ضعیف ہیں۔''

ذہبی کا بھی یہ کہنا ہے کہ اہل علم کی رائے یہی ہے کہ حفص بن عمر ضعیف ہے[2]۔

حفص بن عمر کے بارے میں ابن حجر کی بھی یہی رائے ہے[3]۔

---

[1] ضعفاء العقیلی ۱/۲۵۵۔

[2] الکاشف ۱/۳۴۲۔

[3] تقریب التہذیب ۱/۱۷۳۔

ابن ابی حاتم لکھتے ہیں:

حدثنا عبد الرحمٰن قال سألت أبی عنه فقال لین الحدیث. (الجرح والتعدیل ۳/ ۱۸۲)

''عبدالرحمٰن نے ہمیں بتایا کہ اس نے اپنے والد سے حفص بن عمر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ حدیث بیان کرنے میں غیر محتاط ہے۔''

عقیلی نے حفص بن عمر کے بارے میں 'لا یقیم الحدیث' (وہ روایت کو سیدھا بیان نہیں کرتا) اور 'أدخل شیئا فی شیء' (وہ ایک چیز کو دوسری سے ملا دیتا ہے) کے الفاظ استعمال کیے ہیں[۴]۔

جرجانی نے بعض روایتوں کا حوالہ دینے کے بعد حفص بن عمر کے بارے میں لکھا ہے:

وهذه الأحادیث عن الحکم بن أبان یرویها عنه حفص بن عمر العدنی والحکم بن أبان وإن کان فیه لین فإن حفص هذا ألین منه بکثیر والبلاء من حفص لا من الحکم. (الکامل فی الضعفاء ۱/ ۳۸۵۔۳۸۶)

''یہ احادیث حکم بن ابان سے مروی ہیں۔ اس سے یہ احادیث حفص بن عمر عدنی کے ذریعے سے روایت ہوئی ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ اگر حکم بن ابان غیر محتاط ہے تو حفص اس سے کہیں بڑھ کے غیر محتاط ہے۔ ان روایتوں میں ضعف حکم کی وجہ سے نہیں، بلکہ حفص کی وجہ سے ہے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

...ولحفص بن عمر الفرخ أحادیث غیر هذا وعامة حدیثه غیر محفوظ وأخاف أن یکون ضعیفا کما ذکره النسائی.

''...حفص نے اس کے علاوہ بھی احادیث نقل کی ہیں۔ اس کی احادیث عموماً محفوظ نہیں ہوتیں اور میرا خیال ہے کہ وہ ضعیف ہے جیسا کہ نسائی نے اس کے بارے میں کہا ہے۔''

مزی لکھتے ہیں:

وقال أبو حاتم لین الحدیث وقال النسائی لیس بثقة. (تہذیب الکمال ۷/ ۴۴)

''ابو حاتم نے کہا ہے کہ وہ نقل روایت میں غیر محتاط ہے اور نسائی نے کہا ہے کہ وہ قابل اعتماد نہیں ہے۔''

ابن معین نے بھی کہا ہے کہ حفص قابل اعتماد نہیں ہے اور وہ برا آدمی ہے۔ ملک بن عیسیٰ اور ابوداؤد کے مطابق اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ابوداؤد نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ غیر معروف روایتیں نقل کرتا ہے۔ عقیلی کا کہنا ہے کہ وہ غلط

۴؎ الضعفاء العقیلی ۱/ ۲۷۳۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روایتیں نقل کرتا ہے۔ دار قطنی کی رائے ہے کہ وہ ضعیف ہے[۵]۔

نتیجۂ بحث

زیر بحث روایت کی سند میں مذکورہ بالا ضعف کے باعث یہ بات اعتماد کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ یہ روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف درست طور پر منسوب کی گئی ہے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ راویوں کے فہم کے باعث یہ روایت خلط مبحث کا شکار ہو گئی ہے۔

تخریج: محمد اسلم نجمی
کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۵۔ تہذیب التہذیب ۲/ ۳۵۳۔

ساجد حمید

سمندری جانور اللہ کے ذبح کردہ ہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عن حذیفة رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: ان اللّٰہ ذکی لکم صید البحر هذا.

''حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سمندری جانوروں کا تذکیہ اللہ نے تمھارے لیے کر دیا ہوا ہے۔''

متن کے حواشی

یہ روایت سنن البیہقی، رقم ۱۸۷۴۶ سے لی گئی ہے۔ یہ مختلف الفاظ کے ساتھ درج ذیل مقامات پر وارد ہوئی ہے:
سنن البیہقی، رقم ۵، ۱۸۷۴۷، ۱۸۷۴۸۔

یہ روایت صرف بیہقی کی تخریج ہے اور یہ نوٹ بھی اس پر لکھا ہے: 'اسناد غیر قوی وقد روی عن ابی بکر الصدیق رضی اللّٰہ عنهٔ (اس کی سند کمزور ہے، اور یہ روایت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے)۔ واضح رہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روایت غیر مرفوع نقل ہوئی ہے۔ البتہ اس کا مضمون قرآن و سنت کے مطابق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اثر ہے۔

اس روایت کے الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ بیہقی کی روایت، رقم ۱۸۷۴۷ میں یوں آئے ہیں: 'ما فی البحر من

شیء الا قد ذکاه اللّٰه لکم'(سمندر کی ہر ایک چیز کو اللہ نے تمھارے لیے مذکی کر دیا ہے)۔

بیہقی ہی کی روایت، رقم ۱۸۷۴۷ میں 'ذکا لکم' کی جگہ 'ان اللّٰـه ذبح لکم ما فی البحر فکلوه کله فانه ذکی'(بلاشبہ اللہ نے جو کچھ سمندر میں ہے، تمھارے لیے ذبح شدہ قرار دیا ہے۔ اس لیے اس کا سب کچھ کھاؤ، کیونکہ اس کا تذکیہ ہو چکا ہے) کے الفاظ آئے ہیں۔

سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۸۷۴۸ میں مذکورہ بالا الفاظ کی جگہ یہ الفاظ آئے ہیں: 'کل شیء فی البحر مذبوح'(سمندر کی ہر چیز ذبح کر دی گئی ہے)۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

ایمانیات

(۱۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فرشتوں پر ایمان

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ، مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ، يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (فاطر ۳۵: ۱)

''شکر اللہ ہی کے لیے ہے، زمین و آسمان کا خالق، فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا، جن کے دو دو، تین تین، چار چار بازو ہیں۔ وہ خلق میں جو چاہے اضافہ کرتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کے ذریعے سے مخلوقات کے لیے اپنا حکم نازل کرتے ہیں، انھیں فرشتے کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ان کے لیے 'الملئكة' کا لفظ آیا ہے۔ یہ 'ملك' کی جمع ہے جس کی اصل 'ملأك' ہے۔ اس کے معنی پیام بر کے ہیں۔ سورۂ فاطر کی جو آیت سرعنوان ہے، اس میں خود قرآن نے اشارہ کر دیا ہے کہ انھیں ملائکہ کا نام اسی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم لاہوت کے ساتھ اس عالم ناسوت کا رابطہ ان کی وساطت سے قائم ہوتا اور اس کا تمام کاروبار اللہ تعالیٰ انھی کے ذریعے سے چلاتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بارگاہ خداوندی سے جو حکم انھیں القا کیا جاتا ہے، اس کو وہ ایک محکوم محض کی طرح اس کی مخلوقات میں جاری کر دیتے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی ذاتی اختیار اور ذاتی ارادہ کارفرما نہیں ہوتا۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں، ہر وقت اپنے

پروردگار کی حمد وثنا میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے حکم سے سر موانحراف نہیں کرتے:

وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ، يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ، وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ. (النحل ۱۶: ۴۹-۵۰)

''وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے، اپنے پروردگار سے جو اُن کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انھیں دیا جاتا ہے۔''

ان پر ایمان کا تقاضا جن وجوہ سے کیا گیا ہے، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اس طرح بیان فرمائے ہیں:

''...ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسل کا ایک غیر منفک جزو ایمان بالملٰئکہ ہے۔ ملائکہ کو مانے بغیر خدا اور اس کے نبیوں کے درمیان کا واسطہ غیر واضح اور غیر معین رہ جاتا ہے، جس کے غیر واضح رہنے سے نہ صرف سلسلۂ علم وہدایت کی ایک نہایت اہم کڑی گم شدہ رہ جاتی ہے، بلکہ ہدایت آسمانی کے باب میں عقل انسانی کو گمراہی کی بہت سی راہیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ بات تو دنیا ہمیشہ سے مانتی آئی ہے کہ خدا ہے اور یہ بات بھی اس نے ہمیشہ محسوس کی ہے کہ جب وہ ہے تو اسے اپنی مرضیات سے اپنے بندوں کو آگاہ بھی کرنا چاہیے، لیکن جب وہ کبھی بے نقاب اور رودررو ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ذریعہ اور واسطہ کیا ہے جس سے وہ خلق کو اپنے احکام و ہدایات سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لیے اس نے اپنے خاص خاص بندوں کو منتخب کیا ہے، جن کو انبیا و رسل کہتے ہیں تو بعینہٖ یہی سوال ان کے بارے میں بھی اٹھتا ہے کہ ان نبیوں اور رسولوں کو وہ اپنے علم وہدایت سے آگاہ کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کرتا ہے۔ کیا رودررو ہو کر خود ان سے بات کرتا ہے یا کوئی اور ذریعہ اختیار فرماتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے درمیان علم کا واسطہ وحی ہے جو وہ اپنے فرشتوں، بالخصوص اپنے مقرب فرشتے جبریل کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ یہ فرشتے خدا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اور برتر مخلوق ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ یہ براہ راست خدا سے وحی اخذ کر سکتے ہیں...وحی ورسالت کے ساتھ فرشتوں کے اس گہرے تعلق کی وجہ سے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے لیے ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوا۔ یہ خدا اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے درمیان رسالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ ناگزیر ہیں کہ یہی ایک ایسی مخلوق ہیں جو عالم لاہوت اور عالم ناسوت، دونوں کے ساتھ یکساں ربط رکھ سکتے ہیں۔ یہ اپنی نورانیت کی وجہ سے خدا کے انوار وتجلیات کے بھی متحمل ہو سکتے ہیں اور اپنی مخلوقیت کے پہلو سے انسانوں سے بھی اتصال پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کے سوا کوئی اور مخلوق خدا تک رسائی کا یہ درجہ اور مقام نہیں رکھتی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان رسولوں پر بھی ایمان لایا جائے جو خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رسالت کا واسطہ ہیں۔''(تدبر قرآن ۱/ ۴۲۳)

ان فرشتوں کے جو فرائض اور ذمہ داریاں قرآن میں بیان ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ وہ خدا کا حکم اس کی مخلوقات میں جاری کرتے ہیں۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا، بِاِذْنِ رَبِّهِمْ، مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ. (القدر۹۷:۴)

''اِس (رات) میں فرشتے اور روح الامین اترتے ہیں، ہر حکم لے کر اپنے پروردگار کی اجازت سے۔''

۲۔ وہ جس طرح حکم لے کر اترتے ہیں، اسی طرح بارگاہ خداوندی میں پیشی کے لیے عروج بھی کرتے ہیں۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ، فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ. (المعارج ۷۰:۴)

''فرشتے اور روح الامین (تمھارے حساب سے) پچاس ہزار سال کے برابر ایک دن میں اس کے حضور پہنچتے ہیں۔''

۳۔ وہ نبیوں پر وحی نازل کرتے ہیں۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا، فَاتَّقُوْنِ. (النحل ۱۶:۲)

''اپنے بندوں میں سے وہ جس پر چاہتا ہے، اپنے حکم کی وحی کے ساتھ فرشتے اتارتا ہے کہ لوگوں کو خبردار کرو کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں، اس لیے تم مجھی سے ڈرو۔''

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحی بالعموم جبریل امین لے کر آتے ہیں۔ فرشتوں میں وہ سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور مقرب ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں انھیں براہ راست رسائی حاصل ہے۔ ان کے اور صاحب عرش کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں انھیں صاحب قوت، مطاع اور امین بھی کہا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو ذمہ داری انھیں دی گئی ہے، وہ اس کے لیے تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور ہیں۔ لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی دوسری قوت یا ارواح خبیثہ انھیں کسی بھی درجے میں متاثر یا مرعوب کر سکیں یا خیانت پر آمادہ کر لیں یا خود ان سے اس وحی میں کوئی اختلاط یا فروگزاشت ہو جائے۔ اس طرح کی تمام کمزوریوں سے اللہ تعالیٰ نے انھیں محفوظ کر رکھا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى، وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى، ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى، فَاَوْحٰى

''اُس کو ایک مضبوط قوتوں والے اور ہر لحاظ سے توانا ہستی نے تعلیم دی ہے۔ وہ سامنے آ کھڑا ہوا، جب کہ وہ افق اعلیٰ میں تھا، پھر قریب آیا اور جھک پڑا، یہاں

www.javedahmadghamidi.com

اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی. (النجم ۵۳: ۵-۱۰)

تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو وحی بھی اسے کرنی تھی۔''

۴۔ وہ انسانوں کے علم و عمل کی نگرانی کرتے اور ان کا دفتر عمل محفوظ رکھتے ہیں۔

وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ، کِرَامًا کَاتِبِیْنَ، یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ. (الانفطار ۸۲: ۱۰-۱۲)

''دراں حالیکہ تم پر نگران مقرر ہیں، بڑے معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔''

۵۔ وہ لوگوں کے لیے بشارت اور عذاب لے کر اترتے ہیں۔

وَلَقَدْ جَآءَ تْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی، قَالُوْا: سَلٰمًا، قَالَ: سَلٰمٌ، فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ، فَلَمَّا رَآ اَیْدِیَھُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْہِ، نَکِرَھُمْ، وَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً، قَالُوْا: لَا تَخَفْ، اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ. (ہود ۱۱: ۶۹-۷۰)

''اور ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لے کر پہنچے۔ کہا: تم پر سلامتی ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا: تم پر بھی سلامتی ہو۔ دیر نہیں گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا (اُن کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔ پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اسے اجنبیت محسوس ہوئی اور وہ اُن سے کچھ خوف زدہ ہو گیا۔ وہ بولے: ڈرو نہیں، ہم تو قوم لوط کی طرف (اُس پر عذاب نازل کرنے کے لیے) بھیجے گئے ہیں۔''

سورۂ ہود کی اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ فرشتے انسانوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی طرح کھانے پینے اور اس طرح کی دوسری ضرورتوں سے اس کے باوجود منزہ رہتے ہیں۔

۶۔ وہ خدا کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے اور زمین والوں کے لیے اس کے حضور میں مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ، وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ. اَلَآ، اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ. (الشوریٰ ۴۲: ۵)

''اور فرشتے اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور زمین والوں کے لیے (اُس سے) مغفرت چاہتے ہیں۔ سنو، بخشنے والا اور (لوگوں پر) ہمیشہ رحم فرمانے والا تو اللہ ہی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۷۔ وہ لوگوں کی روحیں قبض کرتے ہیں۔

قُلْ: يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ، ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ. (السجدہ ۳۲:۱۱)

''کہہ دو کہ تمھاری جان وہی فرشتہ قبض کرے گا جو تم پر مقرر ہے، پھر تم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

۸۔ وہ دنیا اور آخرت، دونوں میں ایمان والوں کے رفیق ہیں اور موت کے وقت انھیں جنت کی بشارت دیتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ، ثُمَّ اسْتَقَامُوْا، تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا، وَلَا تَحْزَنُوْا، وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ، وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ، وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ. (حٰم السجدہ ۴۱: ۳۰-۳۱)

''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر ثابت قدم رہے، اُن پر فرشتے اتریں گے (اِس بشارت کے ساتھ) کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور اس جنت کی خوش خبری قبول کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دُنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی تھے اور (اب) آخرت کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں، اور تمھیں اس میں ہر وہ چیز ملے گی جو تم چاہو گے اور اس میں ہر وہ چیز ملے گی جو تم طلب کرو گے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۹۔ قیامت میں وہ بارگاہ خداوندی کے حاضر باش اور تخت الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ، يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ. (الزمر ۳۹:۷۵)

''اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہوں گے۔''

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا، وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ. (الحاقہ ۶۹:۱۷)

''اور فرشتے اس کے کناروں پر (سمٹے ہوئے) ہوں گے اور (اُن میں سے) آٹھ اس دن تمھارے پروردگار کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔''

۱۰۔ دوزخ کا نظم و نسق بھی انھی کے سپرد ہوگا۔

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ، لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ، وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ.

''جس پر تندخو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے۔ اللہ جو حکم انھیں دے گا، اس کی تعمیل میں وہ اس کی

نافرمانی نہ کریں گے اور وہی کریں گے جس کا انھیں حکم دیا جائے گا۔'' (التحریم ٦٦:٦)

قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی صورت جنت میں بھی ہوگی۔

ان فرائض اور ذمہ داریوں کے ساتھ قرآن نے جگہ جگہ ان غلط تصورات کی تردید بھی کی ہے جو لوگوں نے فرشتوں کے بارے میں قائم کر لیے تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ وہ ہرگز خدا کی بیٹیاں نہیں ہیں، جس طرح کہ یہ احمق سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے مقرب بندے ہیں۔ ان کو یہ تقرب اس لیے حاصل نہیں ہوا کہ وہ زور واثر یا ناز و تدلل سے کوئی بات خدا سے منوا سکتے ہیں، بلکہ خدا کی بندگی اور وفاداری کے ہر معیار پر پورے اترنے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ اس طریقے سے کوئی بات منوا لینا تو ایک طرف، وہ خدا کے آگے بات کرنے میں پہل بھی نہیں کرتے اور اسی وقت زبان کھولتے ہیں، جب انھیں اجازت ملتی ہے۔ پھر جو کچھ پوچھا جائے، اس کا جواب بھی ہمیشہ حد ادب کے اندر رہ کر دیتے ہیں اور خلاف حق کوئی بات نہیں کہتے۔ وہ نہ کسی کی سفارش کر سکتے ہیں اور نہ بطور خود کوئی اقدام کر سکتے ہیں، بلکہ ہر وقت حکم کے منتظر اور خدا کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں:

قَالُوا: اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا، سُبْحٰنَهٗ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ، وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ، وَلَا يَشْفَعُوْنَ، اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى، وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ، وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ: اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ، فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ، كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ. (الانبیاء ٢١:٢٦-٢٩)

''یہ کہتے ہیں کہ رحمٰن کی اولاد ہے۔ (ہرگز نہیں)، وہ پاک ہے، بلکہ (یہ فرشتے تو اس کے) مقرب بندے ہیں۔ اس کے حضور میں کبھی بڑھ کر نہیں بولتے اور ہر حال میں اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ ان کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز سے واقف ہے اور کسی کی سفارش نہیں کرتے سوائے اُن کے جن کے حق میں اللہ پسند کرے، اور وہ اس کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں۔ اور ان میں سے جو کہے گا کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک الٰہ ہوں، تو اسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔''

استاذ امام لکھتے ہیں:

''...عقل انسانی عالم لاہوت سے تعلق رکھنے والی ارواح کے تجسس میں ہمیشہ سے رہی ہے اور اس ضرورت کو اس نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اس تلاش میں اگر اس کو کوئی صحیح چیز نہیں مل سکی ہے تو جو غلط سے غلط چیز بھی

اس کے ہاتھ آ گئی ہے، اسی کا دامن اس نے پکڑ لیا ہے۔ عرب کے کاہن وساحر جنات، شیاطین اور ہاتف غیبی کو عالم لاہوت سے تعلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، ہندوستان کے جوتشی اور منجم ستاروں کی گردشوں کے اندر غیب کے اسرار ڈھونڈتے تھے۔ چین کے مندروں کے پجاری اپنے باپ دادا کی ارواح کے توسط سے عالم غیب سے توسل پیدا کرتے تھے۔ قرآن نے ان تمام غلط وسائل اور واسطوں کی نفی کر دی اور ان کے ذریعہ سے حاصل شدہ علم کو رطب و یابس کا مجموعہ ٹھہرایا اور ساتھ ہی یہ حقیقت واضح فرمائی کہ علم الٰہی کا قابل اعتماد ذریعہ صرف ملائکہ ہیں جو انبیا کے پاس آتے ہیں اور جتنا کچھ خدا ان کو دیتا ہے، وہ بے کم وکاست ان کو پہنچا دیتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۴۲۴)

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد وسیم اختر مفتی

طٰہٰ حسین اور ادب جاہلی

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طٰہٰ حسین ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ کو بالائی مصر کے صوبہ المینیا کے ایک گاؤں مغاغہ یا 'عـزبة الـكيلو' کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد ایک شوگر کمپنی میں ملازم تھے۔بچپن میں طٰہٰ حسین کی آنکھیں خراب ہوئیں تو ایک عطائی کو دکھایا گیا جس کے غلط علاج سے وہ ۳ سال کی عمر میں ہمیشہ کے لیے نابینا ہو گئے۔طٰہٰ حسین نے اپنی تعلیم اپنے دادا سے اوراد و ادعیہ سیکھ کر شروع کی۔پھر ایک قطب یعنی قرآن سکھانے اور ابتدائی تعلیم دینے والا مدرسہ میں داخل ہوئے اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ان کے بڑے بھائی نے انھیں الفیہ بن مالک از بر کرا دیا۔۱۹۰۲ء میں انھیں الازہر بھیج دیا گیا، جہاں انھوں نے ۶ سال رہ کر عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ کی تعلیم مکمل کی۔مدرسے کے فارغ اوقات میں شیخ علی المرصفی ''المفصل''، ''دیوان الحماسۃ'' اور ''کامل مبرد'' کے اسباق پڑھاتے تھے، طٰہٰ حسین ان کے درسوں میں بھی شریک رہے۔احمد حسن زیات ان کے ہم سبق تھے، ان سے طٰہٰ حسین کی آخر دم تک رفاقت اور عزیز داری رہی۔برطانوی راج کے دوران میں ۱۹۰۸ء میں قاہرہ یونیورسٹی بنی تو وہاں بڑے شوق سے داخل ہوئے۔وہاں مستشرق نیلنو (Nallino) عربی ادب کی تاریخ اور Guidi جغرافیہ پڑھاتے تھے، طٰہٰ حسین ان کے خیالات سے متاثر ہوئے۔وہ پہلے طالب علم تھے جنھیں اس یونیورسٹی نے ۱۹۱۴ء میں ابوالعلامعری پر مقالہ لکھنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔اسی یونیورسٹی میں وہ عربی ادب کے پروفیسر تعینات ہو گئے۔

حکومت مصر نے ۱۹۱۵ء میں طٰہٰ حسین کو مزید تعلیم کے لیے فرانس بھیجا۔ نابینا ہونے کی وجہ سے ان کے ایک بھائی کو مدد کے لیے ساتھ بھیجا گیا جس نے ان کے ساتھ بے پروائی کا برتاؤ کیا۔ پیرس میں ان کی ملاقات سوزان سے ہوئی جو ان کے علمی کاموں میں ہر طرح سے ان کی مددگار اور نائب ثابت ہوئیں، بعد میں یہی ان کی بیوی بنیں۔ طٰہٰ حسین نے ۱۹۱۸ء میں ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ پر ریسرچ پیپر لکھا جس پر سوربون آرٹس کالج، پیرس نے ۱۹۱۹ء میں انھیں دوسری پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ ۱۹۱۹ء ہی میں یہیں سے رومن قوانین میں ڈپلوما حاصل کیا، اسی سال مصر لوٹ آئے اور جامعہ مصریہ قاہرہ میں قدیم رومی و یونانی تاریخ پڑھانے لگے۔ آکسفورڈ، میڈرڈ اور روم کی یونیورسٹیوں نے طٰہٰ حسین کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

۱۹۲۵ء میں طٰہٰ کلیۃ الآداب (Arts College) میں تاریخ ادب عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں اسی کالج کے پرنسپل بن گئے۔ ۱۹۴۳ء میں جامعہ اسکندریہ کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ ۱۹۵۰ء میں وفد پارٹی کی طرف سے وزیر تعلیم بنائے گئے۔ انھوں نے وزیر تعلیم بننے پر یہ موٹو اپنایا کہ تعلیم پینے والے پانی اور سانسوں میں جانے والی ہوا کی طرح ہر انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ طٰہٰ ہی کی تحریک سے مصر میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم مفت قرار دی گئی۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت کی طرف سے پاشا کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء کے فوجی انقلاب کے بعد سیاست میں حصہ نہ لیا۔ صدر ناصر نے انھیں مصر کا سب سے بڑا سول اعزاز دیا۔ ۱۹۷۳ء میں اقوام متحدہ نے حقوق انسانی کا ایوارڈ دیا۔

طٰہٰ حسین نے قدیم عربی ادب، سیرت نبوی اور تمدن اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ جاحظ، ابوالفرج اصفہانی، ابوحیان توحیدی ان کے محبوب ترین مصنفین ہیں۔ شعرا میں سے بحتری، ابن رومی اور معری کے گرویدہ ہیں۔ انھیں معری کے فلسفۂ حیات سے گہری دل چسپی تھی۔ معتزلہ سے متاثر اور ان کے قدردان تھے۔ اپنے زمانۂ تعلیم میں طٰہٰ حسین اساتذہ کی تنگ نظری سے نالاں تھے۔ جوانی میں فرانس گئے تو حریت فکر اور روشن خیالی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ طٰہٰ حسین نے یونانی ادب اور ڈرامے پر کام کیا تو یونانی افکار نے محض ان کی ادبی نہیں، بلکہ سماجی اور سیاسی سوچ پر بھی گہرا اثر ڈالا، یہ تبدیلی ان کی تمام تحریروں میں جھلکتی ہے۔

طٰہٰ حسین نے نصف درجن کے قریب ناول لکھے۔ ایک فرد کو موضوع بنائے جانے والے ان ناولوں میں سماجی انصاف اور مساوات کا درس پایا جاتا ہے، ان میں عورتوں کے مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ''الایام'' ان کی آپ بیتی ہے، جس میں انھوں نے واحد متکلم کے بجائے غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے گویا کوئی اور شخص ان کا تذکرہ کر رہا ہے یا وہ کسی دوسرے کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں یہ An Egyptian Childhood کے نام سے اور

۱۹۴۳ء میں The Stream of Days کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ یورپ میں طٰہٰ حسین اپنی دوسری کتابوں کی بجائے آپ بیتی سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں ماقبل اسلام شاعری پر طٰہٰ حسین کی متنازع فیہ کتاب ''فی الشعر الجاھلی'' چھپی تو ایک طوفان برپا ہو گیا، اخبارات کے پہلے صفحات طٰہٰ حسین کے خلاف یا ان کے حق میں بیانات سے بھرے ہوتے۔ یہ ردعمل اتنا بڑھا کہ طٰہٰ حسین کو مقدمے کا سامنا کرنا پڑا اور کتاب ضبط ہو گئی۔ مئی ۱۹۲۷ میں اس کا دوسرا ایڈیشن کچھ ترمیمات کے ساتھ ''فی الادب الجاھلی'' کے نام سے شائع ہوا۔ اسی کتاب کی وجہ سے طٰہٰ حسین کو قاہرہ یونیورسٹی کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے جس کے بعد ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا اور سیاسی موضوعات اور معاشرتی مسائل، بالخصوص غربت اور عورت پر ان کے مضامین منظر عام پر آئے۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں ''یونانی ڈرامے کی نظموں کا انتخاب''، ۱۹۲۱ء میں ''ایتھنز کا نظام'' اور ۱۹۲۵ء میں ''رہبران فکر'' شائع کیں۔ طٰہٰ حسین فرانسیسی ادب و ثقافت کے شیدائی تھے۔ انھوں نے فرانسیسی ادب کے ایک بڑے ذخیرے کو عربی میں منتقل کیا۔ ''مرآۃ الاسلام' اور 'علی ھامش السیرۃ'' لکھ کر انھوں نے اپنی روشن خیالی اور آزادروی کا تاثر دور کیا۔

طٰہٰ حسین فصیح عربی کے زبردست حامی تھے۔ وہ قرآن کی زبان اور اس کے رسم الخط کو عربوں میں رابطہ قرار دیتے تھے۔ عمدہ عربی لکھنے والے اس انشا پرداز کا اسلوب سلیس اور دل چسپ ہے۔ جدید خیالات رکھنے کے باوجود ان کی تصانیف میں قدیم عربی زبان کا حسن اور اس کی صحت پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریر میں طنز کی آمیزش ہے، البتہ بعض اوقات جملوں کی طوالت یا کسی لفظ کی تکرار گراں گزرتی ہے۔ طٰہٰ حسین کی تمام کتابیں دل کش اسلوب اور رواں عربی میں لکھی گئی ہیں، لیکن ''الایام'' کی تحریر تو ایسی ہے کہ انسان پڑھ کر وجد میں آ جاتا ہے۔ ''ذکری ابی العلاء''، ''فی الادب الجاھلی''، ''مع المتنبی''، ''فصول فی الادب والنقد''، ''حافظ وشوقی''، ''حدیث الاربعاء''، ''من ادبنا المعاصر''، ''دعاء الکروان''، ''مستقبل الثقافۃ فی مصر''، ''الایام''، ''مرآۃ الاسلام''، ''علی ھامش السیرۃ'' اور ''الوعد الحق'' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

طٰہٰ حسین جب فرانس سے اپنی دوسری پی ایچ ڈی کر کے مصر آئے تو قاہرہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے منسلک ہوئے۔ یونیورسٹی میں آتے ہی انھوں نے طریقۂ تعلیم کو تبدیل کرنے کی سعی شروع کر دی اور اپنا تجویز کردہ منہج نافذ کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ درسی کتابیں پڑھانے کی بجائے انھوں نے علمی و ادبی موضوعات پر لیکچر دینے کا

سلسلہ شروع کیا۔ پہلے انھوں نے قدیم عالمی تاریخ (رومی و یونانی) پڑھائی پھر جاہلی عربی ادب کی تدریس ان کے ذمہ آئی۔ وہ اپنے مضمون کو اپنے خیالات کے مطابق زور شور سے پڑھاتے، ان کی روانی ومہارت طالب علموں کے دل موہ لیتی۔ موجود جاہلی شاعری پر شک کرتے کرتے انھوں نے تمام جاہلی عربی ادب کو افسانہ قرار دے دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان کے طلبہ کی صف میں محمود شاکر بھی بیٹھے ہوتے جو سائنس کی تعلیم چھوڑ کر عربی کے شعبہ میں آئے تھے۔ انھوں نے اپنے استاد کی کلاس ہی میں مخالفت شروع کر دی جو رفتہ رفتہ اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ احمد تیمور نے انھیں لندن سے چھپنے والے ڈیوڈ مار گولیوتھ کے اس مضمون کے بارے میں بتایا جو ان کے خیال میں طٰہٰ حسین کا رہنما بنا تھا۔ یہ کشاکش اتنی بڑھی کہ محمود شاکر نے وہ ادارہ ہی چھوڑ دیا، جہاں ان کے خیال میں گمراہ کن باتیں سکھائی جاتی تھیں حالاں کہ یہاں انھیں مشکل سے طٰہٰ حسین ہی کی سفارش سے داخلہ ملا تھا، کیونکہ اس وقت سائنس کے طالب علم کو ادب عالیہ کے کورسز میں نہ لیا جاتا تھا۔ طٰہٰ حسین نے موقف اختیار کیا کہ سائنس کا ایک طالب علم عربی ادب پڑھنا چاہتا ہے تو اسے کیوں روکا جا رہا ہے؟ محمود شاکر تو جامعہ سے نکل کر جاہلی ادب کے مطالعے میں ایسے منہمک ہوئے کہ اس کے نتیجے میں انھوں نے کئی جاہلی دواوین کی تدوین و تہذیب کر ڈالی، جب کہ طٰہٰ حسین نے اپنے لیکچرز جاری رکھے، بعد میں ان کا سلسلۂ محاضرات ''فی الادب الجاهلی'' کے روپ میں علمی دنیا کے سامنے آیا۔

جاہلیت مسلمانوں کی وضع کردہ اصطلاح ہے، اس سے مراد امی عربوں کا وہ دور ہے جس میں وہ باقی دنیا سے کٹے ہوئے، نور ہدایت سے محروم تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں ماقبل اسلام شاعری پر طٰہٰ حسین کی کتاب ''فی الشعر الجاهلی'' کے نام سے چھپی۔ انھوں نے لکھا کہ ہم آج جو قدیم عربی شاعری ونثر جاہلی لٹریچر کے نام سے پڑھتے ہیں، اصل میں دور جاہلی سے تعلق نہیں رکھتا، کیونکہ اس طرح کی نظم ونثر لکھنا ان لوگوں کے بس میں نہ تھا۔ یہ لٹریچر تو بعد کے مسلمان ادیبوں اور شاعروں نے اسلام کی آمد کے بعد از خود وضع کیا اور اسے جاہلی ادب کا نام دے دیا تاکہ قرآنی آیات کو یقین کا جامہ پہنایا جا سکے اور قرآن میں پائی جانے والی گرامر کی غلطیوں کا جواز پیش کیا جا سکے۔ اس کتاب کے چھپنے پر بہت ہنگامہ ہوا، اس پر کئی دینی وعلمی اعتراضات کیے گئے، حتیٰ کہ مصر کی حکومت کو کتاب کے تمام موجود نسخے ضبط کرنے پڑے اور اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ طٰہٰ حسین نے اپنا نقطۂ نظر تو نہ بدلا، البتہ اس تصنیف کو قابل قبول بنانے کے لیے اس میں کچھ ترامیم کر دیں۔ انھوں نے کتاب کا ایک باب حذف کر دیا اور کئی نئے ابواب اس میں شامل کیے۔ بالآخر ۱۹۲۷ء میں اسے ''فی الادب الجاهلی'' کا نام دیا گیا اور آج یہی

ہمارے سامنے ہے۔ اس میں خط کشیدہ عبارت ڈھونڈے سے نہیں ملتی، ہاں طٰہٰ حسین کے اکثر مغربی سوانح نگار یہ عبارت اب بھی نقل کرتے ہیں جب کہ مصری تذکرہ نگار اسے چھپا جاتے ہیں مبادا طٰہٰ کا علمی و ادبی تشخص بگڑ جائے۔

قرآن مجید وحی الٰہی ہونے کی وجہ سے سرتاسر معجزہ ہے، اس کا لسانی اعجاز یہ ہے کہ اس نے ان عربوں کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا جو نطق و فصاحت کو اپنے لیے خاص سمجھتے تھے اور باقی قوموں کو عجم کے نام سے پکارتے تھے۔ نزول قرآن کے بعد عربوں کے پاس کتاب اللہ سے اعلیٰ کوئی ادب پارہ نہ رہا، کوئی عرب قرآن کے چیلنج پر پورا نہ اتر سکا کہ اس جیسی ایک سورت ہی بنا لاتا۔ گزشتہ صدی میں قرآن کے اس غلبے کو دھندلانے کی کوششیں کی گئیں، اگر یہ کہہ دیا جائے کہ قرآن نے جس شعر کو زیر کیا وہی جعلی ہے اور مابعد قرآن گھڑا گیا ہے تو گویا یہ قرآن کے معجزہ ہونے کا انکار ہوا۔

''فی الادب الجاهلی''میں طٰہٰ حسین نے جاہلی ادب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا۔ کہتے ہیں: ہم جانتے ہیں کہ مکہ، طائف اور مدینہ کے شہروں میں اسلام کی آمد سے پہلے شہری تہذیبیں موجود تھیں۔ اپنی تجارتی و معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے عرب میں آباد یہود و نصاریٰ اور ہمسایہ ملک میں رہنے والے ایرانیوں سے روابط برقرار رکھنے کے لیے عربوں کو لازماً لکھنا پڑھنا پڑتا ہوگا اور دنیا کی دوسری اقوام کی طرح ان کی کچھ دستاویزات یا تحریریں موجود رہی ہوں گی۔ یہ دستاویزات ان اقوام کے علمی و قومی ورثوں کی طرح قطعی علمی طریقوں سے لازماً ہم تک پہنچنی چاہییں تھیں، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قریش جزیرہ نماے عرب کے شمالی شہر مکہ میں بستے تھے، قرآن مجید اسی قوم کے فرد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اس لیے لامحالہ قرآن کی زبان وہی ہوگی جو قریش بولتے تھے۔ اگر کوئی مخطوطہ یا دستاویز قرآن کی زبان کی شہادت میں ہو تو اسے شمالی عرب سے ملنا چاہیے جب کہ یہ امر واقعی ہے کہ ہمیں شمالی عرب سے قریش کی زبان میں ایک بھی مضری نص نہیں ملی، شعری کتبہ ہوتا یا کوئی نثر پارہ۔ اس کے برعکس جنوبی عرب اور یمن سے کچھ مخطوطات کا سراغ ملا ہے، یہ مخطوطات قریش کی زبان میں ہیں اور ہمیں معلوم ہے یہاں یہ زبان نہیں بولی جاتی تھی۔ اس لیے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ یہ گھڑے ہوئے اور وضعی مخطوطات ہیں۔ تمام جاہلی ادب کا یہی حال ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں ہم زمانۂ ماقبل اسلام سے منسوب کی جانے والی تمام عربی نثر کو بالکلیہ رد کرتے ہیں۔ وہ تقریریں جو عرب وفود نے دربار خسروی میں کیں، وہ بلیغ خطبے جو قس بن ساعدہ سے منسوب ہیں اور عرب داناؤں سے منسوب اقوال، ہمارے خیال میں تمام کے تمام دور اسلامی میں وضع کیے گئے۔ خطابت کا فن ویسے ہی تمدن کی نشانی ہے جو عربوں کے ہاں مفقود تھا، صحراؤں میں جنگ و جدال کرنے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

والے خطیب کیسے ہو سکتے ہیں؟ جیسے یونان وروم اور یورپ میں خطابت جمہوری ادوار میں پروان چڑھی اسی طرح عربی خطابت نے اسلام کی آمد کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفا کے ادوار میں نمو پائی۔ جاہلی شاعری کا معاملہ ذرا مختلف ہے، وضع کے باوجود تھوڑی بہت اصل جاہلی شاعری ہم تک منتقل ہوگئی ہے، چنانچہ جہاں ہم اکثر شاعری، معلقات وقصائد کو منحول سمجھتے ہیں وہاں قبل اسلام عربوں کی طرف منسوب کچھ اشعار کو قبول کر لیتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمیں ماقبل اسلام والی نثر کا نمونہ دیکھنا ہو تو کیا کریں؟ ہم قرآن مجید، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور خلفا کے خطبوں میں قدیم عربی نثر کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

طٰہٰ حسین کا طریقۂ تحقیق ان مغربی فلسفیوں اور اہل ادب سے ماخوذ ہے جو دیسکارت سے متاثر ہیں۔ ان لوگوں نے فلسفہ وادب میں مغرب کے رہنے والوں کی رائے بدل ڈالی۔ طٰہٰ حسین کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں جو جاہلی شاعری کو وضعی مانتے ہیں۔ عرب دنیا میں طٰہٰ حسین کے خیالات منظر عام پر آنے سے پہلے ۱۹۲۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر David Margoliouth رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جریدے میں The Origins Of Arabic Poetry کے عنوان سے ایک مضمون لکھ چکے تھے جو ایسے ہی نظریات کے پرچار پر مشتمل تھا۔ مارگولیوتھ نے یہ بھی لکھا کہ میں ایسی باتیں کرنے والا پہلا شخص نہیں ہوں، بلکہ مجھ سے پہلے W Ahlwardt ۱۸۷۲ء میں اپنے تحقیقی مضمون Bemerkungen über die Aechtheit der alten arabischen Gedichte میں اور Sir C Lyall المفضلیات (۲) کے دیباچے میں جاہلی عربی ادب کو انتہائی مشکوک قرار دے چکے ہیں۔ مارگولیوتھ نے اپنے خیالات کی یوں تشریح کی کہ قرآن مجید اپنے سے پہلے پائی جانے والی عربی سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا، اسے شاعری کی بحروں اور نثر کی سجع سے کوئی واسطہ نہیں۔ صرف شاعری کی لے اور آہنگ سے اس کی کچھ مشابہت ہے جو مسلمانوں نے یہی دکھانے کے لیے خاص اس مقصد کے لیے بعد میں گھڑی۔ اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے سورۂ شعراء کی آخری تین آیات (۲۲۴-۲۲۷) کا حوالہ بھی دیا۔ ان آیتوں میں شاعروں کی بے عملی اور ان کے قول وفعل کے تضاد کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس سے قدیم عربی شاعری کا جعلی ہونا کیسے ثابت ہوگیا؟

طٰہٰ حسین کی رائے ہے کہ جاہلی شعر وادب اسلام کی آمد کے بعد ایک گہری کثیر المقاصد سازش کے ذریعے وضع کیا گیا۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ قرآن وحدیث کی سچائی ثابت کرنے کے لیے یعنی زبان ومعنی میں ان دونوں علوم کی معاونت کرنے کے لیے انھیں ایسا کرنا پڑا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''فی الادب الجاھلی'' میں طٰہٰ حسین نے 'ومن الاعاجیب' کے الفاظ بہت استعمال کیے ہیں۔ادب جاہلی کے بارے میں طٰہٰ حسین کے نقطۂ نظر کو بھی اعاجیب طٰہٰ حسین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ اموی وعباسی ادوار کے مسلمان یا طٰہٰ حسین کے خیال میں موقع پرست اتنے ذہین وفطین تھے کہ انھوں نے بلا استثنا ہر جاہلی شاعر کی طرف سے قصیدے اور معلقے وضع کیے اور انھیں اپنے نام کے بجائے ان کے نام سے منسوب کر دیا۔انھوں نے طرح طرح کے خطبے گھڑے اور اپنے نام کی قربانی دے کر قس بن ساعدہ، اکثم بن صیفی اور ذو اصبع عدوانی جیسے گزرے ہووں کے نام لگا دیا اور ان کے اجداد اتنے بلید تھے کہ اپنے لیے دو چار معلقے بھی نہ بنا سکے، کچھ دیوان تخلیق کر سکے نہ چند خطبے کہہ سکے۔کیا ہم نے اپنی زبان اردو میں ایسی عظیم قربانی یا طٰہٰ حسین کے کہنے کے مطابق سازش ہوتے دیکھی ہے؟ حقیقی دنیا میں اتنے بڑے پیمانے پر سازش کرنا یقیناً ناممکن ہے۔کسی یورپی یا افریقی بھاشا میں بھی ایسا ہوا ہے کہ متاخرین نے اپنے ادبی کارنامے اپنے بزرگوں کے کھاتے میں ڈال دیے ہوں؟ H.A.R.Gibb کا کہنا ہے کہ اموی دور میں جاہلی شاعری کی وضع کا نظریہ پیش کرنا اسی طرح ہے جیسے کوئی کہے کہ کیرولین Caroline ڈرامہ (نویں صدی عیسوی کے شاہان انگلستان چارلس اول و دوئم کے ادوار کا ڈرامہ) سامنے رکھ کر الزبتھن (Elizabethan) ڈرامہ (سولھویں صدی کی ملکۂ الزبتھ اول کے عہد کا ڈرامہ، شکسپیئر اسی دور میں پیدا ہوا) تخلیق کیا جا سکتا ہے۔یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ ایسا لسانی غدر مچا اور کسی نے اف تک نہ کی، اس بھری دنیا میں کوئی سلیم الطبع انسان نہ ہوا جس نے اس دھاندلی کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا ہو۔اس دنیا میں بڑے ظلم ڈھائے گئے اور بڑی ناانصافیاں ہوئیں، لیکن کثرت کثیرہ کے خاموش تماشائی بننے کے باوجود ایک اقلیت قلیلہ نے لازماً آواز اٹھائی اور حق کے تاب ناک چہرے سے نقاب ضرور اٹھایا۔اگر ادب جاہلی کے باب میں ایسا نہیں ہوا تو یہ طٰہٰ حسین کے مخصوص نقطۂ نظر کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔اگرچہ چیدہ چیدہ شعر اور جملے جاہلی عبارات میں شامل کیے گئے ہیں، جیسے حماد روایہ، محمد بن اسحاق اور جاہلی ادب کے دوسرے راویوں نے اپنے جمع کردہ مجموعوں کا خلا بھرنے کے لیے اور ان کی تزیین کرنے کے لیے کیا، تاہم ایسے موقعوں پر ناقدین ادب نے اپنی ذمہ داری سے روگردانی نہ کی اور ہر منحول شعر یا عبارت پر تنبیہ ضرور کی۔موجودہ زمانے میں مصطفیٰ صادق رافعی نے ''تاریخ آداب العرب'' میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے۔نقادوں کی ان تنبیہات کو اس بات کی دلیل بھی نہیں بنایا جا سکتا کہ جاہلی ادب میں بڑے پیمانے پر جعل سازی ہوئی اور اسلام سے قبل والا تمام عربی لٹریچر منحول اور وضع کردہ ہے، کیونکہ یہ بات خود ان ناقدین نے بھی نہیں کہی۔طٰہٰ حسین کا نقطۂ نظر غیر سائنسی بھی ہے۔ہم نے طب کی تعلیم کے دوران میں بے شمار امراض کے بارے میں پڑھا کہ

www.javedahmadghamidi.com

ان کے اسباب ووجوہات پر پردۂ جہالت پڑا ہوا ہے۔اس کے باوجود ہم ان بیماریوں کا علاج کرتے رہے، کچھ اپنی ناکافی معلومات کی مدد سے اور کچھ تجربے اور علامتی علاج کے ذریعے سے (Empirically)، اس لیے کہ پیش آمدہ مسائل کو ٹالا نہیں جا سکتا، ان کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈنا پڑتا ہے۔فن حدیث میں بے شمار روایات اور لاتعداد رجال پر تنقید کی جاتی ہے، اس فن کا کوئی ماہر کسی حدیث کو ضعیف یا اس کے راوی کو مخدوش قرار دیتا ہے جب کہ دوسرا اس تنقید کو بے جا قرار دے کر مذکورہ حدیث یا راوی کو سند قبولیت بخش دیتا ہے۔علم و تحقیق کی دنیا میں بھی یہ رد و اخذ چلتا رہتا ہے۔ایک محقق ایک بات کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے جب کہ دوسرا اس ثبوت کو پایے بے تمکین قرار دیتا ہے، اس کے باوجود دونوں خلا میں نہیں رہتے، بلکہ ایک درمیانی حقیقت پر قائم رہتے ہیں۔ ادب عربی پر نقد و جرح کا کافی کام ہو چکا ہے، یہ کام اب بھی جاری رہے تو صحیح یا غلط اور اصل یا نقل کی زیادہ بہتر تمیز کی جا سکتی ہے۔افسوس ہے کہ امت مرحومہ کے بعض اہل علم اپنے دینی و لسانی سرمائے کی تنقیح اور حفاظت کرنے کے بجائے اسے دریا برد کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔اللہ کا شکر ہے کہ مسلمان علما اور مستشرقین کی اکثریت نے طٰہٰ کے نظریات کا رد کیا۔کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر آرتھر جان آربری (Arthur J Arberry) نے طٰہٰ کے پیش رو اور ان کے ہم خیال مارگولیوتھ (Margoliouth) کے نظریات کو غلط ثابت کیا۔

''قطعی علمی طریقہ'' ایسی ترکیب ہے جو طٰہٰ حسین نے بہت استعمال کی ہے۔شاید اس سے ان کی مراد تحقیق کے وہ وسائل ہیں جو مغرب کے اہل تحقیق اپنی ریسرچ کے کام میں لاتے ہیں۔یہ طریقے ان کے ذہن میں خوب پیوست ہیں، ان کی ایک شاگرد سہیر قلماوی نے ماسٹر ڈگری حاصل کی تو انھوں نے ان کو خاص طور پر تلقین کی کہ وہ کسی یورپی ملک جا کر اپنی ڈاکٹریٹ کریں تاکہ وہاں کے وسائل تحقیق سے استفادہ کیا جا سکے۔یقیناً مغربی محققین کسی بات کو ثابت یا رد کرنے کے لیے ہر روڑے اور پتھر کو ہٹاتے ہیں، وہ اس ضمن میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے قبل اسلام کے جاہلی عرب کی زندگی جاننے کے لیے محض عربی ادب میں موجود روایات کا سہارا نہیں لیا، انھوں نے جزیرۂ عرب کے آثار قدیمہ کی کھدائی سے ملنے والے تمام نقوش اور تحریروں کو کھنگالا، پرانے آسمانی صحیفوں، تورات و تالمود کی سطروں کے معنوں اور ما بین السطور مطالب کا کھوج لگایا، قدیم لاطینی ادب کا مطالعہ کیا اور عرب اور عربوں کے بارے میں اس میں موجود اشارات تک سے مدد لی۔پرانے آسمانی مذاہب یہودیت و نصرانیت چھٹی صدی عیسوی سے جزیرۂ عرب میں عمل دخل رکھتے ہیں، ان مذاہب کے ماننے والوں نے اپنی زبانوں کے ادب میں عربوں کا ذکر کیا ہے۔ہیروڈٹس اور بطلیموس (Ptolemmee) وہ قدیم ترین یونانی مصنفین ہیں جن

کے ہاں عربوں کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ مستشرقین نے یونانی زبان میں ان دونوں مذاہب کے لٹریچر سے مدد لی۔ ان کے علاوہ انھوں نے اصل اسلامی مراجع قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کر کے ظہور اسلام سے پہلے بولی جانے والی عربی زبان اور اسلام کے بعد اس میں آنے والی تبدیلیوں کو سمجھا۔ یہ سب باتیں سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ پیغمبر اسلام اور اہل اسلام ہی سے تعصب رکھتے ہوں تو بھی ان کی تحقیق کو بے لاگ سمجھنا ضروری ہے؟ وہ خورد بین لگا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی تعلیمات میں محل اعتراض ڈھونڈتے ہیں اور اسے بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے لاتے ہیں، چاہے کوئی غیر متعلق اور جزئی بات ہو، وہ اسے اصل اور بنیادی حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔

اہل یورپ کے طریقۂ تحقیق کا مطالعہ کرنے کے بعد ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا پرانے آثار و نقوش سے پوری حقیقت کا پتا چل جاتا ہے؟ جو باتیں ان کے ذریعے سے ثابت نہیں ہوتیں کیا وہ حقیقت نہیں ہوتیں؟ کیا یونان میں حقائق پرکھنے کا جو طریقہ صحیح، قطعی اور علمی ہے، عرب میں بھی وہی قطعی اور علمی ہے؟ جس قوم میں پڑھنے لکھنے کا رواج ہی نہ ہو، کیا اس کی تاریخ جاننے کے لیے تحریروں کا کھوج لگانا اور اسی کو علمی، مستند اور یقینی طریقہ کہنے پر اصرار کرنا چاہیے؟ کیا زبانی روایت (Narration) شعر و ادب منتقل کرنے کا ایک مستند ذریعہ نہیں رہی؟ (طٰہٰ کے بعد آنے والے کئی اسکالرز نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ زبانی روایت امی عرب میں علم نقل کرنے کا اہم اور قابل اعتماد ذریعہ رہی ہے۔ میلوں اور عام اجتماعات میں پیش کیے جانے سے شعر کی سند مضبوط ہو جاتی تھی اور غلطیاں نقل ہونے کا امکان بہت کم رہ جاتا تھا)۔ کیا صدر اسلام کے نقادوں کی عربی ادب و لغت کے بارے میں آرا بے وقعت ہیں اور ان کی روشنی میں کسی نثر پارے یا شعری قطعے کو صحیح و سقیم قرار نہیں دیا جا سکتا؟

طٰہٰ حسین ابوالعلا معری اور اس کے فلسفۂ حیات سے بہت متاثر تھے، انھوں نے اپنی پہلی پی ایچ ڈی اپنا تحقیقی مقالہ ''ذکری ابی العلاء'' ہی لکھ کر حاصل کی۔ صیغۂ غائب میں بیان کی جانے والی اپنی خود نوشت سوانح ''الایام'' میں انھوں نے خود اور معری کے بیچ میں پائی جانے والی کئی مماثلتوں کا ذکر کیا ہے۔ معری طٰہٰ حسین کی طرح نابینا تھا، بچپن میں دونوں شرمیلے تھے، دوسرے بچوں سے الگ تھلگ رہتے۔ دونوں چھپ چھپ کر کھانا کھاتے تاکہ دوسرا ان پر نہ ہنسے۔ ایک اور بڑی مماثلت جو طٰہٰ نے بیان نہیں کی، معری تشکیک میں مبتلا تھا اور طٰہٰ حسین کو بھی قرآن و حدیث پر ویسا یقین نہیں رہا تھا۔ معری نے قرآن مجید کی کچھ سورتوں میں غلطیاں نکالیں اور طٰہٰ حسین نے قرآن کی پوری زبان ہی کو محل اعتراض قرار دے دیا۔ ممکن ہے، قارئین ہماری بات کو مبالغہ قرار دیں، لیکن اس عظیم عرب اسکالر سے منسوب یہ خیالات ہمارے گواہ ہیں۔ فرماتے ہیں: ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے''، یہ محاورہ قرآنی علوم پر صحیح صادق آتا ہے۔

مسلمانوں کو قرآن کا اعجاز ثابت کرنا تھا، انھوں نے جاہلی شاعری وضع کی، غیر حجازی اور دخیل الفاظ گھڑے، گرامر کے قواعد ایجاد کیے اور سب سے بڑھ کر وسیع ذخیرۂ حدیث وجود میں لے آئے۔ تعجب ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تصنیف ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش'' میں طٰہٰ حسین کا ذکر خیر کر کے ان سے توقع وابستہ کی کہ وہ بہتر انداز میں اسلام کو جدید دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

طٰہٰ حسین کو یونانی ادب کی ثقاہت پر بڑا اعتبار ہے۔ وہ قدیم یونانی لٹریچر کے بارے میں وہ رائے نہیں رکھتے جو قدیم عربی ادب کے بارے میں ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک یونانی ادب زندہ ہے، قدیم اور جدید ادب میں رشتہ برقرار ہونے کی وجہ سے قدیم ادب محفوظ رہا، اس لیے یونانی ادب پارے ثقہ ہیں اور ویسے منحول اور جعلی نہیں جس طرح وہ ماقبل اسلام پائے جانے والے عربی شہ پاروں کو قرار دیتے ہیں، حالاں کہ خود یونانی زبان کے ماہرین ان کی رائے کے برعکس خیال ظاہر کرتے ہیں۔ صرف Iliad اور Odyssey کی مثال کو لیا جائے جو مشہور یونانی شاعر ہومر کی تخلیقات ہیں تو بات واضح ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں رزمیہ مثنویاں آٹھویں صدی ق م میں تخلیق کی گئیں۔ اس قدر پرانے زمانے میں کاغذ قلم موجود نہ تھے، اس لیے یہ نظمیں زبانی تخلیق کی گئیں۔ اس طرح کے ادب پاروں میں خیالات کو پہلے سے مروج سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے، لے اور آہنگ طے شدہ ہوتے ہیں، اس بات کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے کہ سامعین اسے سن کر محفوظ ہوں۔ ایک قادر الکلام شاعر، البتہ اپنی خواہش اور پسند سے نظم کے جاری فارمولوں میں تبدیلی کر لیتا ہے۔ Iliad میں پائی جانے والی یونانی کوئی شخص نہیں بولتا، اس میں بے شمار علاقائی بولیاں شامل ہیں۔ اس میں ایسی تراکیب پائی جاتی ہیں جو ہومر کے کافی عرصہ بعد یونانی زبان میں استعمال ہوئیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تراکیب ان نظموں کے مرتبین نے اصل متن میں داخل کیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دونوں نظمیں الگ الگ اشخاص کی تخلیق ہیں گویا ہومر ایک شخص نہیں، بلکہ ایک سے زیادہ اشخاص ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ (Odyssey) کا اختتامی حصہ منحول ہے۔ اہل یونان کو اپنا ادب پیارا تھا، اس لیے ان اختلافات کو یہ نظریہ اپنا کر دور کر لیا گیا کہ تحریری کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے ان نظموں کو زبانی گایا جاتا تھا، اس لیے نسلوں کے گزرنے کے ساتھ ان کے الفاظ میں فرق آتا گیا۔

کیا وجہ ہے کہ شدید عربی عصبیت رکھنے والے طٰہٰ حسین نے جو عربی کو ایک عالمی زبان سمجھتے ہیں، اپنی اس پیاری زبان کے ذخیرۂ ادب کو بچانے کے لیے یونانیوں جیسا رویہ نہ اپنایا، بلکہ الٹا اسے دریا برد کرنے کا مشورہ دے دیا؟ انھیں اپنے ادب کی قربانی دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ زبان کا کوئی نقص نہیں، بلکہ ان کی اپنی بے یقینی

ہے،ان کو اپنی زبان میں نازل ہونے والے قرآن پر پورا یقین نہیں تھا،اس لیے قرآن کے زمانۂ نزول کی زبان کو خاص طور پر معرض شک میں ڈالا،اس کے برعکس مابعد قرآن والی عربی انھیں بہت محبوب ہے اور اسی عربی کا پرچار کرتے ہوئے انھوں نے اپنی عمر گزار دی۔

مطالعۂ مزید:'الخطابة'(ابوزہرہ)،'تاریخ الادب العربی'(ابن زیات)،'الجدید فی الادب العربی'(حنا فاخوری)،'الایام'(طٰہٰ حسین)،' فی الادب الجاهلی '(طٰہٰ حسین)،'طٰہٰ حسین'(احمد علمی)،'الی طٰہٰ حسین فی عید میلاده السبعین '(عبدالرحمان بدوی)،معارف،مارچ۲۰۰۶ء(دارالمصنفین،اعظم گڑھ)، Arabic Language (Wikipedia) ، Encyclopedia Britanica On Pre-Islamic Poetry & The Qur'an, Arabic Language (Terri De Young)

(قاسم اقبال،ایس ایم سیف اللہ)۔اردو دائرۂ معارف اسلامیہ(پنجاب یونیورسٹی)۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پروفیسر خورشید عالم

چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن''

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

(۷)

''الاقناع''، شمس الدین محمد بن احمد الشربینی الخطیب الشافعی کی مشہور کتاب ہے۔ وہ اس کتاب (۱:۱۸۶) میں فرماتے ہیں: ''آزاد عورت کا ستر چہرے اور ہاتھ کے جوڑ تک ہتھیلیوں کے اندر اور باہر کے ماسوا ہے، کیونکہ اللہ کا قول ہے: 'الا ما ظھر منھا' جس کی تفسیر چہرے اور ہتھیلیوں سے کی گئی ہے۔ وہ اس لیے ستر نہیں، کیونکہ ان کو کھلا رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

''عمدۃ السالک'' شہاب الدین ابی العباس احمد بن النقیب المصری (۷۶۹ھ) کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے صفحہ (۴۹) پر ہے کہ ''ماسوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے عورت کا سارا بدن ستر میں شامل ہے۔''

''انوار المسالک فی شرح عمدۃ السالک'' شیخ محمد الغمراوی کی کتاب ہے۔ وہ عمدۃ السالک کے متن ''ماسوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے عورت کا سارا بدن ستر ہے'' کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''دونوں ہتھیلیوں کا اندرونی اور بیرونی حصہ ہاتھ کے جوڑ تک۔''

''فتح المعین'' علامہ شیخ زین الدین ابن عبدالعزیز الملیباری الشافعی (۹۸۷ھ) کی کتاب ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''آزاد عورت (خواہ چھوٹی ہو) کا ستر چہرے اور ہاتھ کے جوڑ تک ہتھیلیوں کے اندر اور باہر کے سوا ہے۔'' (۲۴۰)

میں نے فقہ شافعی کے امام اور متقدمین شافعی فقہا کی کتابوں کے حوالے زمنی ترتیب کے ساتھ پیش کر دیے

ہیں۔ان تمام حوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مضمون نگار نے دو ایک متاخرین فقہا کے حوالے پیش کیے ہیں۔انھوں نے ان حوالوں کو پیش کرتے وقت بھی دیانت وامانت کا خون کیا ہے جن کی مثال میں نیچے پیش کر رہا ہوں۔

ا۔''المبدع'' میں ابن مفلح کا حوالہ دیتے وقت اس عبارت کو حذف کر دیا ہے جو ان کے تصور سے متعارض تھی۔ ''المبدع'' (ا:۳۶۳) میں 'المقنع' کے متن (چہرے کے سوا عورت کا سارا جسم ستر ہے) کی تشریح یوں کی ہے جیسے عورت کا سر اور پنڈلیاں۔اس بات پر اجماع ہے۔صاحب مضمون نے تشریح کی یہ عبارت حذف کر دی ہے اور غلط طور پر 'کلها عورة حتی ظفرها' کے قول کو قول مشہور کے طور پر ابن ہبیرہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔حالاں کہ میں اوپر ابن ہبیرہ کی اپنی تصنیف سے حوالہ دے چکا ہوں کہ وہ امام احمد کے اس قول کو مشہور سمجھتے ہیں جو جمہور فقہا کے قول سے مطابقت رکھتا ہے۔اسی حوالہ کے آخر میں ابن مفلح کا قول ہے کہ ابن تمیم نے ایک روایت کا ذکر کیا ہے کہ ''چہرہ ستر میں شامل ہے، جبکہ قاضی نے اس کے برعکس روایت کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس پر اجماع ہے۔'' ان واضح الفاظ کو مضمون نویس نے اس لیے قلم زد کر دیا ہے کہ اس میں قاضی عیاض کے قول اور اس پر اجماع کا بیان ہے۔کیا یہ دیانت داری ہے؟

۲۔امام غزالی نے اپنی فقہ کی کتاب ''الوجیز'' میں ستر کے بارے میں واضح موقف اختیار کیا ہے۔اس کو نظر انداز کر کے ''احیاء علوم الدین'' کی اس عبارت کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے آداب معاشرت کے سلسلہ میں ''الاعتدال فی الغیرة'' کے عنوان سے لکھی ہے۔میں امام غزالی کی متعلقہ عبارت کا اردو ترجمہ نقل کر رہا ہوں اور جن جملوں کو صاحب مضمون نے حذف کیا ہے، ان کے نیچے خط کھینچ رہا ہوں تا کہ پتا چلے کہ کہاں کہاں کتر بیونت ہوئی ہے:

<u>''پانچواں ادب معاشرت۔غیرت میں اعتدال۔عورت کو چاہیے کہ کسی ضروت کے بغیر گھر سے نہ نکلے، کیونکہ سیر سپاٹے اور غیر ضروری کاموں کے لیے نکلنا شرافت کو بٹا لگاتا ہے اور بعض اوقات فساد کا باعث بنتا ہے۔پھر اگر گھر سے نکلے تو چاہیے کہ مردوں سے آنکھیں نیچی رکھے۔</u> ہم یہ نہیں کہتے کہ مرد کا چہرہ عورت کے حق میں ایسے ستر ہے جیسے عورت کا چہرہ مرد کے حق میں، بلکہ اس کو ایسے جاننا چاہیے کہ جتنا صفاچٹ (امرد) لونڈے کا چہرہ مرد کے حق میں ہے کہ فتنہ کے خوف کے وقت مرد کو اس کا چہرہ دیکھنا حرام ہے، اسی طرح مرد کو عورت کا چہرہ فتنہ کے خوف کی حالت میں دیکھنا حرام ہے اور اگر خوف فتنہ نہیں تو حرمت بھی نہیں۔پرانے زمانوں سے مرد کھلے منہ پھرتے ہیں اور عورتیں نقاب ڈال کر نکلتی ہیں۔اگر مردوں کے چہرے عورت کے حق میں ستر ہوتے تو مردوں کو نقاب اوڑھنے کا حکم ہوتا یا عورتوں کو باہر نکلنے سے منع کر دیا جاتا۔''

خط کشیدہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نے عبارت سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کی ہے۔

ایک حوالے میں تو انھوں نے ''ہم نہیں کہتے کہ مرد کا چہرہ عورت کے حق میں ایسے ستر ہے جیسا عورت کا چہرہ مرد کے حق میں'' کا جملہ بغیر کسی سیاق وسباق کے پیش کیا ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ گویا یہاں 'ستر عورۃ' کی بحث ہو رہی ہے۔ جبکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بات علمی دیانت کے منافی ہے۔ درحقیقت امام غزالی عورت کو باہر نکلتے وقت اسلامی آداب بتا رہے ہیں تاکہ غلط فہمی کی وجہ سے فتنہ نہ کھڑا ہو جائے اور غیرت کا بے جا استعمال نہ ہو۔ وہ غیرت میں اعتدال کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایسی دلیل پیش کی ہے جو علما کے درمیان وجہ نزاع ہے۔ یعنی عورت تو مرد کو دیکھ سکتی ہے، مرد عورت کو نہیں۔ یہ مسئلہ مضمون کی پانچویں قسط میں ام سلمہ کے آزاد کردہ غلام نبہان کی روایت کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ وہاں میں نے حدیث کا فنی تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ نبہان مجہول ہے۔ اس کے ساتھ میں نے تفصیلاً بتایا ہے کہ یہ نقطۂ نظر سورۂ نور کی آیت ۳۰ اور سنت متواترہ کے خلاف ہے۔ وہاں پر یہ بحث دیکھی جا سکتی ہے۔ تکرار کی چنداں حاجت نہیں۔ قرآنی حکم کے تحت مرد اور عورت کی نگاہ میں کوئی فرق نہیں۔ دوسری جو امام غزالی نے عورتوں کے نقاب اوڑھنے کی بات کی ہے۔ انھوں نے صرف مشاہدہ کی بات کی ہے، شرعی طور پر اس پر بحث نہیں کی۔ اوپر انھوں نے عورت کے چہرے کو امرد کے چہرے سے تشبیہ دے کر بات ہی صاف کر دی ہے۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب ''ردالمختار علی درالمختار'' (۱:۲۹۹) میں ہے کہ ''عورت کے چہرے کا حکم خوب صورت امرد کے چہرے کی طرح ہے، بلکہ وہ اس سے بڑھ کر فتنہ کا باعث ہے جس طرح امرد کو شہوت کی نظر کے بغیر دیکھنا جائز ہے، اسی طرح عورت کو شہوت کی نظر کے بغیر دیکھنا جائز ہے'' (یہاں تک تو امام غزالی ہمارے موقف کی تائید کرتے ہیں)۔ صاحب ''ردالمختار'' فرماتے ہیں کہ کیونکہ شہوت کے بغیر امرد (صفاچٹ لونڈا) کا چہرہ دیکھنا جائز ہے، اس لیے اسے نقاب اوڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بالکل اسی طرح چونکہ شہوت کے بغیر عورت کا چہرہ دیکھنا بھی جائز ہے، اس لیے اسے بھی نقاب اوڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ امام غزالی نے مشاہدے کی بنیاد پر جو نتیجہ نکالا ہے، وہ ان کے اپنے دعویٰ کے خلاف ہے۔ پھر امام غزالی نے جو عورتوں کے نقاب اوڑھنے کا ذکر کیا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ وجوباً نقاب اوڑھتی تھیں، جیسے صاحب مضمون کا موقف ہے۔ بلکہ امام شوکانی نے تو وضاحت کر دی ہے کہ ان کے لیے نقاب اوڑھ کر نکلنا جائز تھا نہ کہ واجب۔ بہر حال امام غزالی اور امام شوکانی کے بیانات سے بھی مضمون نویس کو اپنا موقف ثابت کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ امام غزالی کا عورت کے ستر کے بارے میں وہی موقف ہے جسے انھوں نے اپنی کتاب ''الوجیز'' میں 'ستر العورۃ' کے تحت بیان کیا ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے بند تک ہتھیلیوں کو چھوڑ کر عورت کا سارا بدن ستر ہے۔ مضمون نویس نے اس حوالہ کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا ہے یا سہواً اس کی وضاحت کا ان کو حق

www.javedahmadghamidi.net

حاصل ہے۔

صاحب مضمون نے امام شوکانی کی ''نیل الاوطار'' کی چھٹی جلد کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ اس میں ان کو اپنے مزعومہ خیال کی جھلک نظر آتی ہے، مگر ''نیل الاوطار'' کی دوسری جلد (۲: ۵۴) کو نظر انداز کر دیا ہے، کیونکہ وہاں انھوں نے زیر بحث موضوع پر براہ راست بات کی ہے جو ان کو اچھی نہیں لگی۔ یہاں امام شوکانی نے ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے: 'باب ان المراۃ کلھا عورۃ الا وجھھا و کفھا' (یہ باب اس بارے میں ہے کہ عورت کا سارا جسم سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے ستر ہے۔) امام شوکانی نے یہ عنوان باندھ کر اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ آزاد عورت کے ستر کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کو چھوڑ کر اس کا سارا بدن ستر ہے۔ ہادی اور قاسم نے اپنے ایک قول میں اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ امام شافعی نے اپنے ایک قول میں اور امام ابو حنیفہ نے ایک روایت میں یہی بات کہی ہے اور امام مالک نے بھی۔ ایک قول ہے کہ ستر میں دونوں پاؤں بھی شامل ہیں اور پازیب کا مقام بھی۔ قاسم کی اپنے دوسرے قول میں اور ابو حنیفہ کی اپنی دوسری روایت میں یہی رائے ہے۔ ایک قول ہے کہ چہرے کے سوا سارا بدن ستر ہے۔ امام احمد بن حنبل اور داؤد کا یہی مذہب ہے۔ ایک قول ہے کہ اس کا سارا بدن ستر ہے اور یہ شافعی کے کچھ اصحاب کی رائے ہے اور احمد بن حنبل سے بھی ایک روایت ہے۔ ان اقوال میں اختلاف کا سبب اللہ تعالیٰ کے قول 'الا ما ظھر منھا' کی تفسیر کا اختلاف ہے۔ امام شوکانی کی اس تفصیل سے چند باتوں کا پتا چلتا ہے:

۱۔ ستر کے لیے نص قطعی سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۱ ہے۔

۲۔ جمہور فقہا نے ماسوائے چند شافعی اصحاب اور احمد بن حنبل کی ایک روایت کے اس بات کی تائید کی ہے کہ چہرے اور ہتھیلیوں یا پھر صرف چہرے کو چھوڑ کر عورت کا سارا بدن ستر ہے۔

۳۔ ''سوائے چہرے کے سارا بدن'' اس بات کو امام احمد بن حنبل کا مذہب قرار دیا گیا ہے اور سارے بدن کو محض ان کی ایک روایت۔

اس واضح اور تفصیلی موقف کی موجودگی میں اس حوالہ کی کیا حیثیت ہے جو صاحب مضمون نے پیش کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت کو نقاب اوڑھنے کی اجازت تھی۔

مضمون نویس نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے جو دو حوالے دیے ہیں۔ ان پر میں چوتھی قسط میں خثعمیہ اور فضل بن عباس کی روایت کے تحت گفتگو کر چکا ہوں۔ وہاں حافظ ابن حجر کا موقف دیکھا جا سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

صاحب مضمون نے ''عون المعبود'' اور ''بذل المجھود'' کے جو دو حوالے دیے ہیں۔ ان کے بارے میں فقہ حنفی کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں۔ وہ حوالے فتنہ کی شرط سے مشروط ہیں۔ ان میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں۔ یہی اصل اور دائمی حکم ہے۔ فتنہ ایک عارضی حالت ہے۔ جب شرط ختم ہو گی مشروط بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر صاحب مضمون کا موقف تو یہ ہے کہ عورت کے لیے چہرے کو چھپانا واجب ہے۔ اس میں فتنہ اور غیر فتنہ کا کوئی دخل نہیں۔

صاحب مضمون نے 'سدل' کے بارے میں امام شافعی اور ابن قدامہ کے حوالے دے کر خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ چوتھی قسط کے جواب میں 'سدل' کے بارے میں میں تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ اس کا خلاصہ بے محل نہ ہوگا:

۱۔ 'سدل' اور 'تغطیہ' میں واضح فرق ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسماء کی روایت میں لفظ 'تغطیہ' کو 'سدل' پر محمول کیا ہے۔ 'سدل' یہ ہے کہ سر کے اوپر سے فریم یا کسی اور طریقے سے کپڑا چہرے کے دائیں بائیں اس طرح لٹکا لیا جائے کہ وہ چہرے کو بالکل نہ چھوئے، اگر اس نے چہرے کو چھو لیا تو فدیہ واجب ہوگا۔ صاحب ''عون المعبود'' نے اسے ناممکن قرار دیا ہے۔

۲۔ فقہا نے 'سدل' کی اجازت اس شرط پر دی ہے کہ مرد عورتوں کے بالکل قریب سے گزر رہے ہوں اور ان کی وجہ سے عورتوں کو دقت محسوس ہو رہی ہو یعنی یہ اجازت صرف خاص حالات میں ہے۔

۳۔ حضرت عائشہ کی ایک روایت میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو ایسا کر لے۔ یعنی یہ واجب نہیں صرف اجازت ہے۔

۴۔ حضرت عائشہ نے ایک روایت میں 'سدل' سے منع کیا ہے اور لوگوں کا عمل اسی کے مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب کی دو چار عورتوں کے سوا دنیا کی کوئی عورت اس پر عمل پیرا نہیں۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ جس چیز پر عمل نہیں ہو رہا، اس کو بطور دلیل پیش کرنے پر مضمون نویس کیوں مصر ہے؟

قرآن حکیم سورۂ رعد (۱۳: ۱۷) میں یہ سنہری اصول پیش کرتا ہے: 'فاما الزبد فیذهب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض'' ''سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے اور وہ جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔'' ناقابل عمل چیز ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی۔

آخر میں محمد جواد مغنیہ کی ''الفقه علی المذاهب الخمسة'' (ص ۸٦) کا حوالہ پیش کرنا مناسب رہے گا۔ موضوع کا عنوان ہے: ''عورت اور اجنبی''۔ عورت کے لیے اجنبی آدمی سے کیا چھپانا واجب ہے؟ اس بات پر

اتفاق ہے کہ اس حالت میں عورت کا سارا جسم بجز چہرے اور ہتھیلیوں کے ستر میں شامل ہے، کیونکہ سورۂ نور میں ہے: 'لا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن' ''اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو (عادتاً) کھلا رہتا ہے اور چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیں۔'' (۲۴:۳۱) کیونکہ ظاہری زینت سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ جہاں تک سورۂ احزاب کی اس آیت کا تعلق ہے: 'و یدنین علیھن من جلابیبھن' ''اپنے جلباب اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں یا نیچے کرلیا کریں۔'' (۳۳:۵۹) تو جلباب چہرے کو نہیں ڈھانپتا، بلکہ اس کا مطلب قمیص یا کھلا کپڑا ہے۔

چہرے کے پردے کے بارے میں صاحب مضمون نے غلط دعویٰ کیا ہے کہ اس پر تمام مسلمان علما کا اتفاق ہے۔ مذاہب اربعہ کے بارے میں میں نے جو تفصیل بیان کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا ایک قول ہے کہ چہرے کا پردہ واجب نہیں۔ ان ائمہ نے دلیل کے طور پر تین باتیں کہی ہیں۔ ایک تو سورۂ نور کی آیت 'الا ما ظھر منھا' کا حوالہ اور ابن عباس کے قول سے اس کی تائید اور ابن عمر کی روایت کہ عورت حالت احرام میں نہ نقاب اوڑھے اور نہ دستانے پہنے اور اس سے یہ استدلال کہ اگر چہرے کا پردہ واجب ہوتا تو ان اعضا کو چھپانا حرام قرار نہ دیا جاتا۔

۲۔ ان ائمہ میں سے کسی نے اور نہ ہی متقدمین فقہا میں سے کسی نے فتنہ کی شرط لگائی ہے، بلکہ یہ تصریح ضرور کی ہے کہ قرآن میں غض بصر کا حکم فتنہ کو روکنے کے لیے ہے۔ جن متاخرین نے فتنہ کی شرط لگائی ہے ان میں سے بھی اکثر چہرے کو ڈھانپنا مستحب سمجھتے ہیں نہ کہ واجب۔

۳۔ امام احمد بن حنبل کا ایک قول ہے کہ عورت کا سارا بدن ستر ہے یہاں تک کہ عورت کو نماز میں بھی نقاب اوڑھنا چاہیے۔ کسی حنبلی فقیہ نے اس قول پر عمل نہیں کیا، بلکہ ان کے قول کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ مطلق قول 'الا ما ظھر منھا' سے مقید ہے۔ اس لیے اس میں چہرے کا استثنا شامل ہے۔ جہاں تک نماز کے اندر اور باہر کے ستر کا تعلق ہے، یہ بعض متاخرین کے ذہن کی اختراع ہے، امام احمد کا قول نہیں۔ امام موصوف کا مشہور اور بہترین قول پہلا قول ہے، جیسا کہ ابن قدامہ نے کہا ہے اور وہ ائمۂ ثلاثہ کے قول کے مطابق ہے۔

۴۔ مذاہب اربعہ کی فقہ کی کتابوں میں صرف قرآن حکیم کی سورۂ نور کی آیت 'الا ما ظھر منھا' اور ابن عباس کے قول کا حوالہ دیا گیا ہے، بلکہ ابن نجیم نے ''البحر الرائق'' (۱:۲۸۴) میں یہاں تک کہا ہے کہ ''اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، خواہ ابن مسعود اس کی تفسیر اوپر والے کپڑوں سے کرتے رہیں'' اور ابوبکر الجصاص نے یہاں تک کہا

ہے کہ ''ابن مسعود کا قول بے معنی ہے، کیونکہ زینت سے مراد وہ عضو ہے جسے مزین کیا گیا ہو۔'' امام اوزاعی اور ابن حزم نے بھی اسی قول کی تائید کی ہے۔ دور جدید کے فقہا ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور شیخ محمد الغزالی کی بھی یہی رائے ہے۔

۵۔ صحابۂ کرام میں سے حضرت عائشہ اور ابن عمر کے اقوال ابن عباس کے قول کی تائید ہیں، جبکہ ابن مسعود کے قول کو کسی صحابی نے قبول نہیں کیا۔ تابعین عظام میں سے ابن سیرین اور حسن کے علاوہ تمام تابعین، مثلاً سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، قتادہ، عکرمہ، مسور بن مخرمہ، عبدالرحمان بن زید، جابر بن زید اور ضحاک نے ابن عباس اور ابن عمر کے قول کی تائید کی ہے۔ اس قول کو صاحب مضمون نے ضعیف قرار دیا ہے جس کا جواب دیا جا چکا ہے۔

۶۔ میں نے چھٹی قسط کے جواب میں 'الا ما ظهر منها' کی تفسیر میں قدیم وجدید بیس مفسرین کا حوالہ دیا ہے جو اس آیت سے مراد چہرے اور ہتھیلیوں کا استثنا لیتے ہیں۔ کئی ایک دوسری تفاسیر کا حوالہ ابھی دینا باقی ہے۔ صاحب مضمون نے چھٹی قسط میں صرف ایک تفسیر ''زاد المسیر'' کا حوالہ دیا ہے جو ابن الجوزی کی تفسیر ہے اور اس حوالہ میں بھی انھوں نے علمی دیانت کا ثبوت نہیں دیا۔ اس تفسیر میں 'الا ما ظهر منها' کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ اس کے بارے میں سات اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اوپر والے کپڑے ہیں۔ جسے ابو الاحوص نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے اور ایک اور متن میں اس سے مراد چادر ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہتھیلی، انگوٹھی اور چہرہ ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ اس سے مراد سرمہ اور انگوٹھی ہے۔ ان دونوں اقوال کو سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد کنگن، انگوٹھی اور سرمہ ہے۔ یہ مسور بن مخرمہ کا قول ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ اس سے مراد سرمہ، انگوٹھی اور خضاب/ مہندی ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ چھٹا قول حسن کا ہے کہ اس سے مراد انگوٹھی اور کنگن ہیں۔ اور ساتواں قول یہ ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ گویا کہ ایک طرف عبداللہ بن مسعود کا قول جسے ابو الاحوص جیسے مدلس نے روایت کیا ہے اور دوسری طرف چھ اقوال جسے سعید بن جبیر، مسور بن مخرمہ، مجاہد، حسن اور ضحاک کے پائے کے تابعین نے روایت کیا ہے۔ اس کے آگے جس عبارت کا حوالہ صاحب مضمون نے دیا ہے، وہ ابن الجوزی کے الفاظ نہیں، بلکہ قاضی ابو یعلیٰ کے الفاظ ہیں جنھوں نے امام احمد کے قول کا ذکر کیا ہے۔ اس قول پر پہلے بحث گزر چکی ہے۔

۷۔ محدثین میں ابوداؤد، ابن ابی شیبہ، بیہقی، طبرانی اور ذھبی نے اس نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ ابوداؤد کی روایت کی تقویت، منذری، زیلعی، عسقلانی اور شوکانی کے پائے کے محدثین نے کی ہے۔ دور جدید کے سب سے بڑے

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

محدث امام ناصر الدین البانی نے اس حدیث اور ابن عباس کے قول کی بڑھ چڑھ کر تائید کی ہے۔ ان کی کتاب ''جلباب المراۃ المسلمہ'' نے مخالفین کو لاجواب کر دیا ہے۔

۸۔ امام جعفر صادق کے قول اور ''الفقہ علی المذاھب الخمسۃ'' کے مصنف محمد جواد مغنیہ کا حوالہ میں اپنے مضمون میں پیش کر چکا ہوں۔ اسی بنیاد پر قاضی عیاض کے پائے کے محدث نے اس نقطۂ نظر کے بارے میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

۹۔ میں نے تفسیر، حدیث اور فقہ کے میدان میں ائمہ کے حوالے تفصیل سے دیے ہیں، اس کے باوجود صاحب مضمون کا یہ دعویٰ کہ چہرے کے پردے کے وجوب کے بارے میں تمام مسلمان علما کا اتفاق ہے، کس قدر غلط ہے؟ بالفاظ دیگر مذکورہ بالا مفسرین، محدثین اور فقہا کا شمار ان کے نزدیک علما میں نہیں ہوتا، بلکہ علما ان کے نزدیک صرف دو چار متاخرین یا سعودی عرب کے مفتی ہیں۔

۱۰۔ ان کا یہ دعویٰ بھی سراسر نادرست ہے کہ احادیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عورتیں عہد رسالت، صحابہ اور تابعین کے دور میں اپنا چہرہ چھپاتی تھیں۔ انھوں نے اپنی سات قسطوں میں جو دلائل پیش کیے ہیں، ان کا جواب تو میں نے قسط وار دے دیا ہے۔ جہاں تک احادیث مبارکہ کا تعلق ہے تو انھوں نے صرف اور صرف پانچ حدیثوں پر بات کی ہے۔ ان حدیثوں پر ان کی تنقید کا جواب میں نے انتہائی مدلل طریقے سے دے دیا ہے۔ جس کتاب کو بنیاد بنا کر انھوں نے یہ پانچ احادیث نکالی تھیں، وہ علامہ البانی کی تصنیف ''جلباب المراۃ المسلمہ'' ہے۔ اس میں مصنف نے صفحہ ۶۰ سے لے کر صفحہ ۷۳ تک تیرہ احادیث کو چہرے کے پردے کے عدم وجوب کے بارے میں پیش کیا ہے۔ صرف پانچ حدیثوں پر تنقید کر کے صاحب مضمون کے علم کے خزانے خالی ہو گئے اور ان کی ہمت جواب دے گئی ابھی تو آٹھ احادیث اور سولہ آثار (صفحہ ۹۶ سے لے کر صفحہ ۱۰۳) باقی ہیں۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ ان احادیث اور آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت اور اس کے بعد کے ادوار میں عورتوں کے لیے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنا جائز تھا۔ مجھے امید ہے کہ مولوی محمد زبیر سلفی صاحب ان باقی ماندہ آٹھ احادیث اور سولہ آثار کے بارے میں اپنے علمی کمالات کا اظہار فرما کر اپنے تواتر عملی کے دعویٰ کا کوئی ثبوت پیش کریں گے۔

۱۱۔ تواتر عملی کا دعویٰ کرنے سے پہلے کاش صاحب مضمون تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے۔ طبقات ابن سعد، اسد الغابہ اور الاصابہ کی آخری جلدوں کا اور اسماء الرجال کی کتابوں کا مطالعہ کر لیتے تو انھیں پتا چلتا کہ خواتین عہد نبوت اور بعد کے ادوار میں کھلے چہروں کے ساتھ دینی، ادبی، ثقافتی اور عملی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ وہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جہاد میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ ان کو پانی پلاتی تھیں۔ مسجد کے اندر پنج گانہ اور جمعہ کی نمازوں، مسجد سے باہر نماز استسقا اور عیدین میں شرکت کرتی تھیں۔ درس وتدریس میں حصہ لیتی تھیں۔ روایت حدیث اور اجازت حدیث میں ان کا مقام منفرد تھا۔ شعروادب میں خنساء، سعدیٰ، صفیہ، امامہ، صفیہ بنت حارث، ارویٰ، عاتکہ بنت زید، ام ایمن، کبشہ بنت رافع، میمونہ بلویہ اور رقیہ نامور ہیں۔ خنساء تو صاحب دیوان ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور آپ 'ھیة یا خنیس' کہہ کر ان کا استقبال کرتے اور شعر کی فرمایش فرماتے۔ صنعت وحرفت، تجارت میں شریک ہوتی تھیں۔ انصار کی عورتیں نخلستانوں میں کاشت کاری کھلے منہ سے کرتی تھیں جس طرح ہمارے دیہات کی سترفی صد آبادی میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ ہمارے ہی ملک پر منحصر نہیں کھیتی باڑی کا کام ہر جگہ ہر ملک میں مرد اور عورتیں مل جل کر کرتے ہیں، کیونکہ اس کے بغیر یہ کام چل ہی نہیں سکتا۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر سر پر ٹوکری رکھ کر مدینہ سے دو ڈھائی کلومیٹر دور حضرت زبیر بن عوام کے گھوڑے کے لیے چارہ بنا کر لاتی تھیں۔ میرا مشورہ ہے کہ صاحب مضمون اس سلسلہ میں عمر رضا کحالہ کی ''اعلام النساء'' کا مطالعہ ضرور کریں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خالد مسعود

نبی موعود کی آمد

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ساڑھے پانچ سو برس گزر گئے تو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا کی قبولیت کا وقت آ گیا کہ اس ہستی کی ولادت ہو:

جس کو اللہ تعالیٰ کی خلافت میں سب سے اعلیٰ و اشرف مقام عطا ہونے والا تھا۔

جس کے ہاتھوں اس قصر نبوت کی تکمیل ہونی تھی جس کے لیے تمام انبیا و رسل جدوجہد کرتے رہے۔

جس کو اللہ تعالیٰ کسی خاص قوم کے لیے ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے اخلاق و کردار کے اعلیٰ نمونہ کے طور پر پیش کرنے والا تھا۔

جس کے ہاتھوں آسمانی ہدایت اس طرح محفوظ ہونے والی تھی کہ اس کے کسی حصہ کو چھپانا ممکن ہو، نہ اس میں تحریف کرنا۔

جس کے انتظار میں یہود و نصاریٰ بھی چشم براہ تھے اور بنی اسماعیل بھی، اور ہر کسی کی خواہش تھی کہ یہ ہستی ان کے اندر پیدا ہو۔

بالآخر یہ شرف بنو اسماعیل کے حصہ میں آیا، جو شرک میں ملوث ہونے کے باوجود ابھی بہت سی خوبیوں کے مالک اور ابراہیمی مرکز توحید کے محافظ و منتظم تھے کہ ان کے اندر اللہ کے عظیم رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہو

اوران کے ہاتھوں ایک عظیم امت مسلمہ برپا ہو جو رہتی دنیا تک خدا کے کلام کو اکناف عالم تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔

سلسلۂ نسب

بنی اسماعیل میں اپنا نسب محفوظ رکھنے اور سلسلۂ نسب کو یاد رکھنے کا خصوصی اہتمام تھا۔ وہ نہ صرف اپنا، بلکہ دوسرے قبائل کا نسب نامہ بھی یاد رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں مرد و زن سب کے کئی کئی درجوں تک نسب بالعموم نقل کیے جاتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب یوں ہے:

محمد بن عبد اللّٰہ بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مره بن کعب بن لوی بن غالب بن فهر بن مالك بن نضر بن کنانه.

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مرہ ہیں۔ اس طرح کلاب بن مرہ سے والد اور والدہ، دونوں کے نسب ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ کنانہ سے اوپر یہ سلسلہ عرب کی مشہور و معروف شخصیت عدنان تک اور مزید اوپر حضرت اسماعیل علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ سلسلۂ نسب شرافت و نجابت کے لحاظ سے عرب کے اعلیٰ سلسلوں میں سے ہے۔ خاندانوں کی مثال معادن کی ہوتی ہے۔ جس طرح سونے کی کان میں سے سونا اور چاندی کی کان میں سے چاندی نکلتی ہے، اسی طرح اچھی روایات کے حامل خاندانوں میں سے اچھے لوگ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کی اولاد میں سے بنو کنانہ کو منتخب کیا۔ بنو کنانہ میں سے قریش کو چن لیا۔ قریش میں سے بنو ہاشم کو ممتاز کیا اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو منتخب کر لیا[1]۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبد اللہ کی عمر ۲۴ سال تھی جب ان کے والد عبد المطلب نے بیٹے کے لیے بنو زہرہ کے سردار وہب بن عبد مناف کی بیٹی آمنہ کا رشتہ مانگا۔ سیرت نگاروں کے مطابق وہب کا چند سال قبل انتقال ہو چکا تھا، لہٰذا آمنہ کے ولی ان کے چچا وہیب بن عبد مناف تھے۔ انھوں نے عبد المطلب کی تجویز مان لی اور عبد اللہ اور آمنہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد قریش کا تجارتی قافلہ شام جا رہا تھا۔ عبد اللہ اس میں شامل ہو کر غزہ روانہ ہو گئے۔ والد نے ان کو ہدایت کی کہ واپسی کے سفر کے دوران میں یثرب میں کھجوروں کا سودا طے کرتے ہوئے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی۔ عیسیٰ البابی الحلبی مصر ۲/۳۱۰۔

آ ئیں۔ وہ یثرب میں اپنے ننھیال بنوعدی بن النجار کے ہاں رکے تو بیمار ہو گئے۔ بیماری کی شدت میں سفر کے قابل نہ رہے۔ قافلہ مکہ پہنچا تو عبدالمطلب کو تشویش لاحق ہوگئی۔ انھوں نے بڑے بیٹے حارث کو یثرب روانہ کیا کہ بیٹے کی تیمارداری کریں اور ان کو مکہ لے آئیں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ کا انتقال ہو چکا۔ حارث نے واپس مکہ آ کر والد کو یہ خبر سنائی۔ عبداللہ کے انتقال کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابھی شکم مادر ہی میں تھے۔

تاریخ ولادت

سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت دوشنبہ (پیر) کے روز پہلے عام الفیل کے ماہ ربیع الاول کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی۔ ربیع الاول کی تاریخ کے بارے میں اختلاف ہے۔ مروج تصور کے مطابق یہ تاریخ ۱۲ تھی، لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اگر یہ تاریخ درست مانی جائے تو پیر کے روز کے ساتھ اس کی مطابقت نہیں ہوتی۔ بالعموم سیرت نگاروں نے مصری ہیئت دان محمود پاشا کے حوالہ سے ۹ ربیع الاول کو درست تاریخ مانا ہے۔ یہی تاریخ قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' میں اختیار کی ہے، جو ۲۲ اپریل ۵۷۱ء اور یکم جیٹھ ۶۲۸ ء بکرمی سے مطابقت رکھتی ہے[۲]۔

رضاعت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدا میں اپنی والدہ آمنہ نے اور ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا۔ قریش کے ہاں دستور تھا کہ وہ اپنے نومولود بچوں کی ابتدائی پرورش ان کو صحرا کے بدو قبائل میں بھیج کر کرتے تھے تا کہ وہ شہر کی آلودہ فضا سے دور کھلی فضا میں پھلیں پھولیں۔ مکہ کی عام زبان مختلف علاقوں کے باشندوں کی آمدورفت اور تجارتی لین دین کے باعث کافی متاثر ہو چکی تھی۔ اس لیے قریش کو اعلیٰ عربی پر قدرت حاصل کرنے اور زبان کو محفوظ کرنے کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑتا۔ مکہ اور طائف کے درمیانی علاقہ میں بسنے والا قبیلہ بنوسعد اپنی فصیح و بلیغ زبان کی بدولت عرب بھر میں شہرت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس قبیلہ کی عورتیں نومولود بچوں کو دودھ پلانے کی خدمت کے مقصد سے وقتاً فوقتاً مکہ آیا کرتیں اور قریش اپنے بچے ان کے حوالہ کر دیا کرتے تا کہ انھیں خالص بدویانہ عربی زبان بولنا آ جائے۔

قریش کے اسی رواج کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے کسی دایہ سے بچے کو دودھ پلوانے کے لیے

۲۔ رحمۃ للعالمین۔ قاضی سلیمان منصور پوری ۱۶/۲۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بنوسعد کی عورتوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی تو انھیں ایک یتیم بچہ کو قبول کرنے میں تامل ہوا۔انھیں یہ خیال ہوا ہو گا کہ جس بچے کا باپ موجود نہیں اس کی پرورش کا فراخ دلانہ حق الخدمت ہمیں کہاں سے ملے گا۔ بالآخر ایک دایہ حلیمہ سعدیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کر لیا۔اس کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ نہایت مفلوک الحال تھیں اور ان کی سواری بھی نہایت کمزور تھی۔لہٰذا قریش کی امیر زادیاں اپنے بچے ان کے حوالہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔جب حلیمہ کسی امیر گھرانے کا بچہ حاصل کرنے میں ناکام ہو گئیں تو خالی ہاتھ صحرا کو لوٹنے کے بجائے اس یتیم بچے ہی کو قبول کر لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کی بدولت حلیمہ کے گھر میں برکت ظاہر ہوئی اور بعد میں انھیں اپنے فیصلہ پر کبھی پچھتانا نہیں پڑا۔ بنوسعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام شاید پانچ سال کی عمر تک رہا۔بعد میں آپ صحابہ سے فرمایا کرتے:

''میں تم سب میں فصیح تر ہوں، کیونکہ میں قریش سے ہوں اور میری زبان بنوسعد بن بکر کی زبان ہے[۳]۔''

مکہ اگرچہ ایک بین الاقوامی شہر تھا جہاں ملک عرب اور یمن کے تمام قبائل کی زبان سمجھی جاتی تھی،لیکن اس کے باوجود قریش کے ہاں زبان کی صحت وفصاحت کا خاص اہتمام پایا جاتا تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ماں کی جدائی

صحرا میں چند برس گزارنے کے بعد حلیمہ سعدیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ واپس لائیں تو ایک مختصر مدت کے لیے آپ کو والدہ کی شفقت میسر آئی۔ جب آپ کی عمر چھ سال تھی والدہ آپ کو یثرب لے گئیں۔معلوم ہوتا ہے کہ والدہ کے پیش نظر اپنے شوہر کی قبر کی زیارت تھی جس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً یثرب جایا کرتی تھیں۔ان کا قیام طویل ہو گیا اور وہ عبدالمطلب کے ننھیال بنوعدی بن النجار کے ہاں تقریباً ایک ماہ رہیں۔اس عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب کی گلیاں دیکھنے اور مضافاتی علاقہ جاننے کا موقع ملا۔واپسی کے سفر کے دوران میں والدہ بیمار پڑ گئیں اور مکہ کی راہ کی ایک منزل ابواء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ام ایمن جو عبداللہ کی لونڈی اور اس سفر میں آمنہ کے ساتھ تھیں،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ واپس لے آئیں اور انھی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پرورش میں لیا۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنوہاشم خاندان کا ایک فرد ہونے کے باعث قبیلہ کے سربراہ عبدالمطلب کی تولیت میں آ گئے۔عبدالمطلب آپ پر بڑی شفقت فرماتے،حرم میں اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنی مسند پر ساتھ بٹھاتے۔ یہ

---

[۳] الطبقات الکبریٰ،محمد بن سعد ۱/۷۱۔

صورت دو برس ہی قائم رہ سکی اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ سال تھی تو دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کا جنازہ اٹھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تابوت کے پیچھے چلنے والوں میں تھے اور دادا کی شفقتوں کو یاد کر کے روتے جا رہے تھے۔

عبدالمطلب نے اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے زبیر کو اپنا وصی بنایا تھا، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب اپنے ان تایا کے سایۂ شفقت میں آ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کم سنی ہی میں تایا زبیر سے زیادہ انس تھا اور وہ بھی آپ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ کتب سیرت میں ان کی لوریاں نقل ہوئی ہیں جو وہ بھتیجے کو سناتے تھے۔ ان کی زندگی میں آپ انھی کی کفالت میں رہے:

کان الطف عمیه به و یقال او صاه عبدالمطلب بان یکفله بعده[۴]۔

''وہ آپ کے چچاؤں میں آپ پر سب سے زیادہ شفیق تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے انھی کو وصیت کی تھی کہ ان کے بعد بھتیجے کی کفالت کریں۔''

زبیر کی سربراہی کے دوران میں بنو کنانہ اور ہوازن کے درمیان ایک جنگ ہوئی جسے حرب فجار کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں زبیر بنی ہاشم کے رئیس کی حیثیت ہی سے شامل ہوئے۔ انھی کے دور میں معاہدہ حلف الفضول ہوا تھا اور وہ اس کے روح رواں تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس معاہدہ میں شرکت کی اور اس وقت آپ کی عمر ۲۰ برس تھی۔ جب ۲۵ برس کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی تو خطبۂ نکاح ابوطالب نے بطور سربراہ خاندان دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبیر کا انتقال اس وقت ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۲۲، ۲۳ برس کے ہو چکے تھے اور اب آپ کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ گویا کفالت کا پورا دور زبیر کے ساتھ آپ نے گزارا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لڑکپن کی دل چسپیاں

لڑکپن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کی بکریاں چرائیں۔ بعض اہل تحقیق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بکریاں چرانے کے معاملہ کی مطابقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کے ساتھ نہیں پاتے۔ ان کے نزدیک قریش کے نوجوان بکریاں چرانے کا پیشہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ یہ کام غلاموں سے لیا جاتا تھا۔ ہمارے نزدیک مجمل طور پر یہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں کہ جس طرح نوعمر لڑکے ہر کام کو انہماک سے دیکھتے اور اس سے شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نوعمری میں گلہ بانی میں دل چسپی لی ہوگی، اگرچہ

---

[۴] انساب الاشراف، بلاذری۔

اس کو بطور پیشہ اختیار نہ کیا۔ آخر بنوسعد کے ہاں تو لڑکوں بالوں کا مشغلہ ہی نہیں، بلکہ پیشہ گلہ بانی تھا۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اس سے دل چسپی پیدا ہونا کچھ بعید نہیں۔ قریش کے دوسرے لڑکے بھی اس میں دل چسپی رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ تھے تو ایک مہاجر خاتون خولہ بنت حکیم کو آپ سے کچھ شکایت ہوئی۔ انھوں نے برملا کہا کہ اے عمر، میں نے تمھارا وہ زمانہ دیکھا ہے جب تم عکاظ میں دن بھر بکریاں چراتے تھے اور لوگ تمھیں اے عمیر، اے عمیر کہہ کر پکارتے تھے۔ آج مسلمانوں کے خلیفہ بن گئے ہو تو رعایا کے معاملہ میں خدا سے ڈرو[۵]۔ یہ عمر وہ تھے جن کے پاس مکہ میں سفارت کا محکمہ تھا اور قریش کے بااثر لوگوں میں تھے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے بکریاں چرانے کا پیشہ تو اختیار نہیں کیا تھا، بس دل چسپی کے لیے بچپن میں کسی گڈریے کے ساتھ چلے جاتے ہوں گے۔

قریش کے نوجوان فنون حرب بھی سیکھتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت اچھے نشانہ باز، تیرانداز، شمشیرزن اور پہلوانی کے کرتب جاننے والے تھے۔ آپ کی یہ تربیت بعد کے ادوار میں کفار کے خلاف کام آئی۔ آپ کے جنگی منصوبوں کی آج بھی اہل فن داد دیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تربیت آپ نے عنفوان شباب ہی میں حاصل کی تھی۔

حلف الفضول

ماضی بعید میں جب بنوجرہم کا مکہ پر تسلط تھا، حمایت مظلوم کے مقصد سے کچھ لوگوں نے ایک معاہدہ کیا تاکہ ظالموں کا ہاتھ روکیں اور مکہ میں آنے جانے والوں کو ان ظالموں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھیں۔ معاہدہ کرنے والے تین اشخاص کے ناموں میں 'فضل' کا لفظ آتا تھا، اس لیے اس معاہدہ کا نام 'حلف الفضول' پڑ گیا۔ یہ معاہدہ تو صدیوں سے ختم تھا، لیکن اس کا نام اچھے لوگوں کے حافظہ میں تھا۔ اس کی بازگشت مکہ میں دوبارہ اس وقت سنائی دی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۰ سال تھی۔

قبیلۂ زبید کا ایک تاجر سامان تجارت لے کر مکہ میں وارد ہوا۔ قرشی سردار عاص بن وائل نے سودا کر کے سامان اپنے قبضہ میں لے لیا، لیکن جب قیمت ادا کرنے کا سوال آیا تو لیت ولعل سے کام لینے لگا۔ تاجر نے اپنی جان پہچان کے لوگوں سے مدد چاہی تو عاص کی حیثیت کے پیش نظر کوئی شخص اس کے خلاف کوئی اقدام کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مایوس ہو کر وہ علی الصبح کوہ ابی قبیس پر چڑھ کر دہائی دینے لگا کہ اے اولاد فہر، وادی مکہ میں ایک غریب الدیار اور بے سہارا شخص کا سامان ہتھیا لیا گیا۔ وہ پراگندہ بال ابھی حالت احرام میں ہے اور اس نے عمرہ ادا نہیں کیا۔ حجر اسود اور حطیم کے درمیان جلوہ افروز ہونے والو، اس کی مدد کو پہنچو، کیونکہ اس مقام کی حرمت کا مستحق شریف و کریم شخص ہے

۵۔ الاستیعاب، ابن عبدالبر ۲/ ۷۲۳۔

نہ کہ حق تلفی اور بدعہدی کرنے والا۔

یہ پکار سن کر زبیر بن عبدالمطلب اور بعض دوسرے لوگ بھاگ کر تاجر کے پاس گئے۔اس نے صورت حال بیان کی تو زبیر کی تحریک پر لوگ قرشی سردار عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے۔سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ حلف الفضول کی طرز پر ایک نیا معاہدہ کیا جائے جس کے مقاصد یہ ہوں کہ ہم مسافروں کی حفاظت کریں گے، بے آسرا لوگوں کی معاونت کریں گے، زبردست کو کمزور پر ظلم کرنے سے روکیں گے اور مکہ میں مقامی و غیر مقامی کے درمیان امتیاز کیے بغیر ہر مظلوم کی نصرت و حمایت کریں گے۔اس معاہدہ میں بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو اسد، بنو زہرہ اور بنو تمیم شریک ہوئے۔

اس معاہدہ کے بعد سب نے مل کر عاص بن وائل سے زبیدی تاجر کو اس کا حق دلوایا اور بعد میں بھی بڑے لوگوں سے معاملہ کرنے میں یہ معاہدہ کام آتا رہا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم عین شباب میں اس معاہدہ میں شریک ہوئے، لیکن بعثت کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ بن جدعان کے گھر جو معاہدہ ہوا وہ مجھے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔اگر آج بھی مجھے کسی ایسے معاہدہ میں شرکت کی دعوت دی جائے تو میں اس کو فوراً قبول کر لوں گا۔[۶]

کسب معاش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب معاشی جدوجہد میں باقاعدہ حصہ لینے کی ہوئی تو دوسرے قرشی نوجوانوں کی طرح آپ بھی تجارتی سفروں پر جانے لگے۔آپ کے تجارتی سفروں کے بارے میں جتنا کچھ روایات میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ابتدائی سفر ابوطالب کی معیت میں شام کی طرف ہوئے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوطالب کوئی امیر آدمی نہ تھے، بمشکل اپنا کنبہ پالتے تھے۔وہ ٹانگ سے معذور بھی تھے، اس لیے تجارتی سفروں پر جانا ان کے لیے مشکل تھا۔ان کا ذریعۂ معاش عطر فروشی تھا یا کبھی کبھی وہ مقامی طور پر غلے کی تجارت کر لیا کرتے تھے۔[۷] لہٰذا ان کی ہم راہی میں بارہ تیرہ سال کے بھتیجے کا اتنے طویل سفروں پر جانا ناقابل فہم ہے۔البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زبیر کی کفالت میں تھے اور وہ ایک معروف تاجر تھے جو مختلف اطراف میں تجارتی سفر کیا کرتے، لہٰذا جب

۶۔ الطبقات الکبریٰ، محمد بن سعد ۱/۸۶۔

۷۔ المعارف، باب صناعات الاشراف ابن قتیبہ /۲۴۹۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سفر کے قابل ہوئی ہو گی تو آپ ان کے ہم راہ شام، یمن، بحرین وغیرہ کو گئے ہوں گے۔ ابن کثیر کی روایت کے مطابق آپ چودہ برس کی عمر میں یمن گئے۔ ابتدا میں آپ کا سفر محض تعاون وتناصر کے لیے رہا ہو گا۔ بعد میں جیسے جیسے آپ کو کوئی تجارتی قافلہ مل جاتا ہو گا آپ سامان تجارت لے کر اس کے ہم رکاب ہو جاتے ہوں گے۔ سیرت کی کتابوں میں اگرچہ شام اور یمن کے سفروں ہی کا ذکر ملتا ہے، لیکن احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ملک عرب کے بہت سے علاقوں کو دیکھ رکھا تھا اور ان کے بارے میں آپ کی معلومات سنی سنائی نہیں تھیں، بلکہ چشم دید تھیں۔ حتیٰ کہ صحابۂ کرام کو تعجب ہوتا تھا کہ آپ ملک کے بعید گوشوں کے بارے میں ایسی معلومات رکھتے ہیں جو صرف ان علاقوں کے اصل باشندوں ہی کو حاصل ہیں۔ اس لیے امکان اس بات کا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تجارتی سفر اس سے کہیں زیادہ رہے ہوں گے جتنے کہ کتابوں میں مذکور ہوئے ہیں۔

تجارت کی ابتدائی تربیت کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طور پر تجارت شروع کی تو مضاربت کے اصول پر دوسرے کے سرمایہ کے ساتھ اپنی محنت شامل کر کے کی۔ آپ قافلوں کے ساتھ شہر کے تاجروں کا مال لے کر دوسری منڈیوں میں جاتے اور مال بیچ کر منافع میں سے اپنا حصہ وصول کر لیتے۔ اس کام میں آپ کو معاملہ فہمی، صداقت، امانت اور دیانت کے باعث اتنی شہرت ملی کہ مکہ میں آپ کو صادق اور امین کہا جانے لگا۔ آپ پر اعتماد کر کے کسی کو پشیمانی نہ ہوتی۔ آپ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ ہر معاملہ طے کرتے۔ اس کی شہادت طویل عرصہ بعد ایک صحابی سائب بن صیفی بن عائذ مخزومی نے دی۔ وہ مسلمان ہوئے تو لوگوں نے ان کی تعریف وتعارف میں کچھ باتیں کہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کو آپ لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں، کیونکہ یہ ایک زمانہ میں میرے شریک تجارت رہے ہیں۔ سائب نے کہا کہ بلاشبہ آپ نے معاملہ ہمیشہ صاف رکھا۔ یہی شہادت قیس بن سائب مخزومی نے بھی دی۔ سائب رضی اللہ عنہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر عتیق بن عائذ مخزومی کے حقیقی بھتیجے تھے۔

[باقی]

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی'' سے انتخاب)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۲

عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کا یقین ہو گیا تو وہ اس فکر میں مصروف ہو گئے کہ آپ کے بعد ملت اسلامیہ کی کیا صورت ہو گی؟ انھیں علم تھا کہ صرف مسلمانوں کی وحدت ہی انھیں آنے والے فتنوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے، چنانچہ وہ فوراً امین امت ابوعبیدہ بن جراح کے پاس پہنچے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے جواب دیا: جب سے تم نے اسلام قبول کیا ہے، میں نے ایسی نادانی کی بات تم سے نہیں سنی۔ کیا تم میری بیعت کرو گے، جب کہ ثانی اثنین صدیق ہمارے درمیان موجود ہیں؟ ان کی گفتگو جاری تھی کہ انھیں سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع کی خبر ملی۔ عمر نے فوراً ابوبکر کو بلایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے انتظام میں مصروف تھے اور یہ تینوں سقیفہ کی طرف چل پڑے۔ ابوبکر نے بڑی نرمی سے انصار کو سمجھایا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں خلیفہ قریش سے ہونا چاہیے۔ عمر خاموش بیٹھے رہے، جب حباب بن منذر نے انصار و مہاجرین سے دو الگ الگ خلیفہ بنانے کی تجویز پیش کی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں سے تھے اور عرب صرف قریش ہی کی خلافت پر راضی ہوں گے۔ ان دونوں میں تلخ کلامی ہوئی تو ابوعبیدہ نے یوں مداخلت کی: اے انصاریو، تم نصرت و حمایت میں سب سے آگے تھے، اب اس حمایت دین کو

چھوڑنے اور بدل دینے میں اولیت نہ اختیار کرو۔ ان کی اس بات سے انصار نرم پڑے، ابوبکر نے اتحاد امت کے لیے یہ موقع غنیمت جان کر عمر اور ابوعبیدہ، دونوں کا ہاتھ پکڑا اور انصار کو ان میں سے ایک کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی دعوت دی۔ اس مرحلے پر سیدنا عمر ہی نے فیصلہ کن کردار ادا کیا، انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہاتھ بڑھانے کو کہا اور یہ کہہ کر ان کی بیعت کر لی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی کو مسلمانوں کی امامت کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، آپ ہی خلیفۂ رسول ہوں گے۔ عمر کے بعد ابوعبیدہ اور انصار کے بشیر بن سعد نے بیعت کی اور پھر تمام مہاجرین و انصار بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ یوں خلافت کا یہ قضیہ بخیر وخوبی انجام کو پہنچا۔ دوسرے روز عمر نے لوگوں سے معذرت کی کہ مجھے غلط فہمی تھی کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود رہیں گے، اس لیے مجھ سے ایسا طرز عمل سرزد ہوا، انھوں نے سب مسلمانوں کو خلیفۂ اول کی بیعت عام کی دعوت دی۔

خلافت کا فیصلہ ہونے کے بعد دوسرا اہم مسئلہ جیش اسامہ کو روانہ کرنا تھا۔ اسامہ بن زید نے عمر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے حضرت ابوبکر سے درخواست کی کہ وہ ان کے جیش کو مدینہ بلا لیں تاکہ وہ مشرکین کے خلاف ان کی مدد کر سکے۔ ادھر انصار نے عمر کے ہاتھ خلیفۂ اول کو پیغام بھیجا کہ اگر لشکر ضرور بھیجنا ہے تو اسامہ سے زیادہ عمر رکھنے والا جرنیل مقرر کریں۔ عمر یہ دونوں مطالبات لے کر ابوبکر کے پاس پہنچے تو انھوں نے انتہائی سخت جواب دیا کہ اگر مجھے کتے اور بھیڑیے اچک لے جائیں تو بھی اس فیصلے کو رد نہ کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو۔ اس لشکر میں عمر ایک عام سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے، ابوبکر لشکر کو رخصت کر کے واپس لوٹنے لگے تھے کہ انھوں نے اسامہ سے درخواست کی کہ عمر کو میری مدد کے لیے چھوڑ جائیں، ان کی اجازت ہی سے عمر مدینہ آ سکے۔ مدینہ کے پڑوس میں رہنے والے قبائل عبس و ذبیان نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو بھی ان دو جلیل القدر اصحاب رسول کا اختلاف ظاہر ہوا۔ عمر ان لوگوں میں شامل تھے جو مانعین زکوٰۃ کے خلاف فوج کشی نہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جس نے کلمۂ لا الٰہ کہہ دیا مجھ سے اپنے مال و جان بچا لیے۔ ابوبکر نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم میں اس شخص سے ضرور قتال کروں گا جس نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا، اس لیے کہ یہ دونوں فرائض اس کلمے ہی کا حق ہیں۔ عمر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اللہ نے ابوبکر کو اس بارے میں شرح صدر عطا کیا ہے، میں نے تب جان لیا کہ وہ حق پر ہیں۔ مانعین سے نمٹنے کے بعد مرتدین سے جنگ کا مرحلہ آیا تو عمر اور دوسرے اصحاب رسول نے کوئی اعتراض نہ کیا، کیونکہ وہ ابوبکر کی فراست و بصیرت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اسی سلسلے کی جنگ بطاح میں اسلامی فوج کے سپہ سالار خالد بن ولید نے مرتد قبیلے بنو تمیم کے سردار مالک بن نویرہ کو قتل کرنے کے بعد اس کی بیوہ سے شادی کر لی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org / www.ghamidi.net

تو اس معرکے میں شریک ایک انصاری صحابی ابوقتادہ اور مالک کا بھائی متمم بن نویرہ مدینہ آئے۔ یہ دونوں سیدنا ابوبکر سے ملے اور الزام لگایا کہ مالک کو اسلام قبول کرنے کے بعد قتل کیا گیا اور خالد اس کی بیوی کو زمانۂ جاہلیت سے پسند کرتے تھے۔ ابوبکر نے مالک کی دیت اس کے بھائی کو ادا کی، ابوتمیم کے قیدیوں کو چھوڑنے کا حکم دیا اور ابوقتادہ کی خالد پر طعنہ زنی کو ناپسند کیا۔ ابوقتادہ حضرت عمر کے پاس جا پہنچے، سیدنا عمر نے خلیفۂ اول سے مطالبہ کیا کہ وہ خالد سے مالک کا قصاص لیں۔ وہ نہ مانے پھر سیدنا عمر نے خالد کی معزولی پر اصرار کیا، بات اس وقت ختم ہوئی، جب ابوبکر نے دوٹوک جواب دیا کہ میں اس تلوار کو میان میں نہ ڈالوں گا جو اللہ نے کافروں پر سونتی ہے۔ خالد مدینہ آئے تو ابوبکر نے انھیں تنبیہ کر کے مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا۔ جنگ یمامہ کے بعد خالد بن ولید نے بنوحنیفہ کے سردار مجاعہ کی نوجوان بیٹی سے شادی کی تو ابوبکر نے انھیں خط لکھا کہ تمھارے سامنے ۱۲۰۰ مسلمان شہید ہوئے اور تم عورتوں سے نکاح کرتے پھرتے ہو۔ خالد نے خیال ظاہر کیا، اس سرزنش کے پیچھے میرے بھانجے عمر بن خطاب کا ہاتھ ہے۔

یمامہ کی جنگ میں قرآن کے کئی حفاظ شہید ہوئے تو عمر ہی تھے جنھوں نے ابوبکر کو مشورہ دیا کہ قرآن مجید کو مصحف کی شکل میں جمع کیا جائے۔ وہ متردد تھے کہ یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تو میں کیسے کروں؟ عمر نے انھیں دلائل سے قائل کیا۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب زید بن ثابت کے ہاتھوں یہ عظیم فریضہ سرانجام پایا۔ ابوبکر نے مسلمانوں سے عراق کی طرف فوجیں بھیجنے کے بارے میں مشورہ کیا تو کسی نے حوصلہ افزا جواب نہ دیا۔ عمر نے پکار کر کہا: لوگو، تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تمھیں ایک ایسے کام کی دعوت دے رہے ہیں جس میں تمھاری بقا اور زندگی ہے تب سب جہاد کے لیے آمادہ ہو گئے۔ عراق کی جنگ انتہائی اہم تھی، اس میں فتح ہوئی تو عظیم اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ ابوبکر کے عہد خلافت میں عمر دو سال قاضی رہے، مگر ان کے پاس کوئی قضیہ نہ آیا، یہ اس پاکیزہ دور کی کرامت سے اور عمر کے بے لاگ عدل کی شہرت کی وجہ سے ہوا۔ کوئی یہ توقع نہ کر سکتا تھا کہ ان کے سامنے غلط حقائق پیش کر کے یا چرب زبانی سے کام لے کر اپنے حق میں فیصلہ کرا سکتا ہے۔ مرض الموت میں ابوبکر نے خلیفہ کا انتخاب کرنا ضروری سمجھا، عبدالرحمان بن عوف، عثمان، سعید بن زید اور دوسرے اصحاب رسول کے مشورے سے انھوں نے عمر بن خطاب کو اپنا جان نشین مقرر کیا، انھوں نے مسجد نبوی میں جھانک کر وہاں موجود لوگوں سے اپنے فیصلے کی تائید بھی کرائی۔ پھر انھوں نے عمر کو بلایا اور عراق و شام میں جنگ جاری رکھنے کی وصیت کی، انھوں نے ان کو حق پر چلنے کی تلقین کی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ کی رات ابوبکر کی تدفین سے فارغ ہو کر عمر گھر آئے اور اگلے روز، اپنی خلافت کے پہلے دن کی مصروفیت کے بارے میں سوچنے لگے۔ انھوں نے اللہ سے صحیح راہ سجھانے کی دعا کی۔ فجر کی نماز کے بعد ان کی بیعت کا سلسلہ شروع ہوا، ظہر کے وقت خوب بھیڑ ہو گئی تو وہ منبر پر بیٹھے اور حمد و ثنا اور صلاۃ و سلام کے بعد ابوبکر کے فضائل بیان کیے اور فرمایا کہ لوگو، میں تمھاری طرح کا آدمی ہوں اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہ کی حکم عدولی کا خوف نہ ہوتا تو میں تمھارا سربراہ نہ بنتا۔ انھوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور دعا کی کہ اے اللہ، میں سخت ہوں، مجھے نرم کر دے۔ اے اللہ، میں کمزور ہوں، مجھے قوت دے دے۔ اے اللہ، میں بخل رکھتا ہوں، مجھے سخی دل بنا دے۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ مجھے تمھارا جو معاملہ درپیش ہو گا، اسے اچھے طریقے سے اور امانت داری سے نمٹانے میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا۔ نماز کی امامت سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے حاضرین کو مثنیٰ بن حارثہ کے ساتھ عراق جانے کی دعوت دی۔ لوگوں نے تردد ظاہر کیا، کیونکہ انھیں یاد تھا کہ شام کا معرکہ ابو عبیدہ بن جراح، عمرو بن عاص اور یزید بن ابوسفیان سے سر نہ ہوا تھا اور خالد بن ولید ہی کی مدد سے اس میں فتح حاصل ہوئی تھی۔ عمر نے توقف کیا اور واپس مسجد نبوی کو ہو لیے جہاں لوگ ان کی بیعت کرنے کے منتظر تھے۔ عشا کے بعد فراغت ہوئی، یہ رات بھی انھوں نے سوچتے سوچتے جاگ کر گزاری۔ بیعت اگلے دن بھی مسلسل جاری رہی، ظہر کے وقت انھوں نے سب کو ہدایت کی کہ ارتداد کی جنگوں میں مرتدین کے پکڑے ہوئے قیدی لوٹا دیں۔

بیعت تیسرے روز بھی جاری رہی، جب لوگ نماز ظہر ادا کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تو عمر نے ان سے پھر خطاب کیا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ میری سختی سے خوف زدہ ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے غلام اور خادم کی طرح رہا، میں ایک تلوار کی طرح تھا حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ سلم اس تلوار کو میان کے اندر کر دیتے۔ ابوبکر خلیفہ بنے تو میں ان کا ساتھی اور مددگار بن گیا، میری سختی ان کی نرمی سے مل جاتی اور وہ مجھے کنٹرول کر لیتے۔ تمھارے معاملات کی ذمہ داری مجھ پر آئی تو میری سختی نرم پڑ گئی ہے۔ اب یہ مسلمانوں پر ظلم و تعدی کرنے والوں کے لیے مخصوص ہو گئی ہے، دین و سلامتی رکھنے والوں کے لیے میں تم سب سے زیادہ نرم ثابت ہوں گا۔ جو کسی پر ظلم کرے گا، میں اس کا رخسار زمین پر رکھ کر اس کے دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں گا حتیٰ کہ وہ حق کا اقرار کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ امن کے ساتھ رہنے والوں اور نیکی کرنے والوں کے لیے میں اپنے گال زمین پر بچھا دوں گا۔ مجھ پر لازم ہے کہ تمھاری آمدن میں سے کوئی ناجائز وصولی نہ کروں، تمھیں زیادہ وظیفے دوں، تمھاری سرحدوں کی حفاظت کروں اور تمھیں گھروں سے زیادہ دور نہ رکھوں۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سے میری مدد کرو۔ پھر عمر نے ظہر کی نماز پڑھائی اور گھر چلے گئے۔لوگ ان کی تقریر سے متاثر ہوئے، البتہ عراق و ایران جانے سے خوف زدہ رہے۔عصر کے وقت مثنیٰ بھی آئے ،انھوں نے کہا کہ لوگو، ہم نے ایران کے بہترین سرحدی علاقوں پر قبضہ کرلیا ہے،ان شاء اللہ ہمیں آیندہ بھی فتوحات حاصل ہوں گی۔ پھر عمر گویا ہوئے کہ اللہ اپنے دین کو غالب کررہا ہے، وہ اپنے مددگار کو غلبہ عطا کرے گا اور اپنے بندوں کو امتوں کی میراث دے گا تو کہاں ہیں اللہ کے نیک بندے؟ ابوعبید ثقفی اور سلیط بن قیس بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔ رفتہ رفتہ مدینہ سے ایک ہزار مسلمان جہاد میں شامل ہونے کو نکل آئے۔حضرت عمر مسلمانوں کا یہ اجتماع دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔اب اس دستے کی سربراہی کا مسئلہ تھا جس میں صرف اہل مدینہ شامل تھے، یہ لوگ بنوبکر بن وائل کے مثنیٰ کو قیادت نہیں دینا چاہتے تھے۔عمر نے پہلے رضا کار ابوعبید کو لشکر کی قیادت سونپی ،انھیں اصحاب رسول سے مشورہ کرنے اور جنگ میں جلد بازی سے بچنے کی نصیحت کی پھر لشکر کو فوری طور پر کوچ کرنے کا حکم دیا۔

حضرت ابوبکر کی وفات کے اگلے روز ہی حضرت عمر نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو خط لکھا جس میں خلیفہ کی وفات کی خبر کے ساتھ حضرت خالد بن ولید کی معزولی اور ان کی جگہ ابوعبیدہ کو سپہ سالار مقرر کرنے کا فرمان درج تھا۔ انھوں نے یہ نصیحت بھی لکھی کہ مال غنیمت کی امید میں مسلمانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالنا۔عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد کو فوری طور پر معزول کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ اہل تاریخ نے اس ضمن میں بہت کلام کیا ہے۔اصل میں وہ حضرت ابوبکر کے عہد ہی میں انھیں ہٹوانا چاہتے تھے،لیکن ان کے بار بار کے مشوروں کو ابوبکر نے رد کیا۔ابوبکر خالد کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کو سیف اللہ قرار دیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرار دی ہوئی تلوار کو میان میں ڈالنا ابوبکر کے بس میں نہ تھا۔ پھر خالد کی کارکردگی ایسی رہی کہ کوئی اس معیار تک نہ پہنچ سکا۔ان کے برعکس عمر سخت محاسبہ کرنے والے تھے،اپنے دور خلافت میں انھوں نے اپنے گورنروں اور عمال کا کڑا محاسبہ کیا،لہٰذا ان کے مزاج کے مطابق اس کے سوا کوئی فیصلہ نہ ہوسکتا تھا کہ اپنے سپہ سالار کے کردار پر کوئی داغ دھبہ بھی برداشت نہ کیا جائے اور اسے چلتا کیا جائے۔خالد کے بارے میں ان کی رائے پہلے سے بنی ہوئی تھی اور اسی پر انھوں نے عمل کر دیا۔ان کو خالد پر یہ اعتراض بھی تھا کہ وہ جنگ میں جلد بازی کرتے ہیں جس سے بے گناہ افراد کی جانوں کو خطرہ رہتا ہے۔اس کے برعکس وہ ابوعبیدہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے،ان کے پیش نظر بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد رہا جس میں آپ نے ابوعبیدہ کو اس امت کا امین قرار فرمایا تھا۔سربراہ مملکت کے لیے اپنی پسند کے ماتحت کے ساتھ کام کرنا آسان ہوتا ہے، وہ اس کی بات

www.javedahmadghamidi.com

یہاں تک کہ اشارے کو سمجھ لیتا ہے یوں امور مملکت نمٹانا آسان ہو جاتا ہے، یہ امر بھی اس سلسلے میں فیصلہ کن رہا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں رہنے والے یہودیوں کے ساتھ باہم امن وسلامتی سے رہنے کے معاہدات فرمائے، لیکن جب انھوں نے بدر واحد کی جنگوں میں مشرکوں کی مدد کر کے ان معاہدوں کی خلاف ورزی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قتال کر کے انھیں مدینہ سے نکال باہر کیا۔ محض خیبر میں کچھ یہودی رہ گئے جو نصف پیداوار دینے کی شرط پر اپنی زمینیں کاشت کرنے کے لیے آزاد تھے۔ نجران کے عیسائیوں سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیہ وصول کرنے کی شرط پر صلح فرمائی۔ خلافت صدیقی میں یہ معاہدے برقرار رہے۔ عمر فاروق خلیفہ بنے تو انھوں نے ان عہود پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی، ان کی دلیل تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری دور میں نصیحت فرمائی تھی: جزیرۂ عرب میں دو دین نہ رہنے دیے جائیں۔ (مسند احمد، مسند سیدہ عائشہ) انھوں نے یمن کے گورنر یعلیٰ بن امیہ کو ذمہ داری سونپی کہ نجران کے عیسائیوں میں سے جو اپنے دین پر قائم رہنا چاہتا ہے، اسے حدود عرب سے نکال کر یمن یا جزیرۂ عرب کے نواح میں آباد کر دیا جائے۔ مستشرقین نے عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو تعصب قرار دیا ہے۔ مسلمان مورخین نے اس کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں جن میں سے بعض درست بھی ہیں، لیکن صحیح وجہ یہ ہے کہ عہد فاروقی میں جزیرہ نمائے عرب کی وحدت قائم ہو چکی تھی، اس لیے پیغمبر علیہ السلام کے اس فرمان پر عمل کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے یعلیٰ کو تلقین کی کہ اہل نجران کو عیسائیت پر قائم رہنے کی کامل آزادی دی جائے، ان کی جان ومال کا تحفظ کیا جائے اور انھیں جزیرۂ عرب سے باہر ویسی ہی یا اس سے بہتر زمینیں دی جائیں جس طرح کی وہ حدود عرب میں رکھتے تھے۔ خلیفۂ ثانی کے اس حکم کو گزشتہ صدی کی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک عیسائی حکومتوں کے طرز عمل سے کسی طرح مشابہ قرار نہیں دیا جا سکتا جو انھوں نے اپنے اپنے مخالف فرقے کے عیسائیوں کو جلا وطن کر کے، انھیں گوناگوں اذیتیں دے کر اور ان کی جانیں لے کر روا رکھا۔ عیسائیوں کے بعد عمر نے خیبر کے یہودیوں کو بھی جزیرۂ عرب سے باہر آباد ہونے کا حکم دیا تو کسی کو حیرت نہ ہوئی، کیونکہ یہ ان کی اسی پالیسی کا تسلسل تھا۔

مطالعۂ مزید: الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، الفاروق عمر (محمد حسین)، رحمۃ للعالمین (قاضی سلیمان منصور پوری)، تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

نعیم احمد

اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۶ء

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قرآنیات

جنوری	آل عمران (۳:۱۴۴-۱۵۱)	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۱۱
فروری	״ (۳:۱۵۲-۱۵۵)	״ ״	״	۷
مارچ	״ (۳:۱۵۶-۱۶۴)	״ ״	״	۷
اپریل	״ (۳:۱۶۵-۱۷۵)	״ ״	״	۷
مئی	״ (۳:۱۷۶-۱۸۹)	״ ״	״	۱۵
جون	״ (۳:۱۹۰-۲۰۰)	״ ״	״	۵
جولائی	النساء ـــ المائدہ (۴-۵)	״ ״	״	۷
״	النساء (۴:۱)	״ ״	״	۸
اگست	״ (۴:۲-۴)	״ ״	״	۱۳
ستمبر	״ (۴:۵-۱۰)	״ ״	״	۵
اکتوبر	״ (۴:۱۱)	״ ״	״	۷
نومبر	״ (۴:۱۲-۱۴)	״ ״	״	۷
دسمبر	״ (۴:۱۵-۱۸)	״ ״	״	۵

معارف نبوی

جنوری	کسی آدمی پر کفر کا الزام لگانا	معز امجد	صفحہ	۱۵
〃	توحید اور نجات	طالب محسن	〃	۱۸
فروری	آخرت میں شدید ترین سزا کا مستحق	معز امجد	〃	۱۳
〃	جنت کی خوش خبری	طالب محسن	〃	۱۵
مارچ	حکمرانوں کو نصیحت کرنا	معز امجد	〃	۱۳
اپریل	خدا کے احترام سے متعلق ایک روایت	معز امجد	〃	۱۳
〃	کلمہ گو کی حیثیت	طالب محسن	〃	۱۵
مئی	عورت کے لباس کے بارے میں ایک روایت	معز امجد	〃	۲۱
〃	ایمان کا ذائقہ	طالب محسن	〃	۲۳
〃	زندہ جانور کے گوشت کی حرمت	ساجد حمید	〃	۲۷
جون	ایک شہید کے اجر سے متعلق روایت	معز امجد	〃	۱۱
〃	ایمان کی شاخیں	طالب محسن	〃	۱۳
〃	سمندر کا مردار حلال اور پانی پاک ہے	ساجد حمید	〃	۱۸
جولائی	حیا اور ایمان	طالب محسن	〃	۱۱
〃	قریش کے بارے میں ایک روایت	معز امجد	〃	۱۵
اگست	حیا کا ثمرہ	طالب محسن	〃	۱۷
〃	حالت احرام میں ازواج مطہرات کا چہرہ ڈھانپنا	معز امجد	〃	۲۲
〃	کیا گوہ حرام ہے؟	ساجد حمید	〃	۲۴
ستمبر	دین میں استقامت	طالب محسن	〃	۹
〃	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بد دعا کے بارے میں روایت	معز امجد	〃	۱۳
〃	احرام میں موذی جانور کو مارنا	ساجد حمید	〃	۱۵
اکتوبر	بہتر اسلام	طالب محسن	〃	۱۳
〃	قریش کے بارے میں ایک روایت	معز امجد	〃	۱۷

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اکتوبر	کیا گوہ حرام ہے؟		ساجد حمید	صفحہ	۱۹
نومبر	ہاتھ اور زبان کی حفاظت		طالب محسن	؍	۱۱
؍	گوہ کی حرمت اور خیرات کے آداب		ساجد حمید	؍	۱۶
دسمبر	حلاوت ایمان		طالب محسن	؍	۹
؍	قرآن کا انکار کرنے پر کسی کو قتل کرنا		معز امجد	؍	۱۵
؍	سمندری جانور اللہ کے ذبح کردہ ہیں		ساجد حمید	؍	۱۹

دین و دانش

جنوری	ایمانیات (۱)		جاوید احمد غامدی	صفحہ	۲۵
فروری	؍	(۲)	؍ ؍	؍	۲۳
مارچ	؍	(۳)	؍ ؍	؍	۱۵
اپریل	؍	(۴)	؍ ؍	؍	۲۱
مئی	؍	(۵)	؍ ؍	؍	۳۱
جون	؍	(۶)	؍ ؍	؍	۲۵
جولائی	؍	(۷)	؍ ؍	؍	۱۷
اگست	؍	(۸)	؍ ؍	؍	۲۹
ستمبر	؍	(۹)	؍ ؍	؍	۲۱
اکتوبر	؍	(۱۰)	؍ ؍	؍	۳۱
نومبر	؍	(۱۱)	؍ ؍	؍	۱۹
دسمبر	؍	(۱۲)	؍ ؍	؍	۲۱

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شذرات

جنوری	قربانی	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۲
؍	اسلامی نظریاتی کونسل کا کردار	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	؍	۸

فروری	تہذیب مشرق	منظور الحسن	صفحہ	۲
مارچ	استحکام پاکستان	〃	〃	۲
اپریل	اہل سیاست اور سیاسی استحکام	منظور الحسن	〃	۲
مئی	آزادی رائے، مغرب اور امت مسلمہ	محمد عمار خان ناصر	〃	۲
〃	مصعب اسکول سسٹم	منظور الحسن	〃	۶
جون	تقلید اور اجتہاد	〃	〃	۲
جولائی	اخلاقی جارحیت	〃	〃	۲
〃	مذہب، اخلاقیات اور تعلیم	خورشید احمد ندیم	〃	۴
اگست	حدود آرڈی نینس ــــ جناب جاوید احمد غامدی کا موقف	منظور الحسن	〃	۲
ستمبر	علم و تحقیق کا المیہ	جاوید احمد غامدی	〃	۲
اکتوبر	صبر اور شکر کی آزمایش	خورشید احمد ندیم	〃	۲
نومبر	ادارہ سازی اور قومی تعمیر	〃	〃	۲
دسمبر	قرآن کا موضوع	جاوید احمد غامدی	〃	۲

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حالات و وقائع

جنوری	''مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟''	جاوید احمد غامدی/محمد یاسر عرفات	صفحہ	۵۷

نقطۂ نظر

جنوری	مسجد اور عورت امام ابن حزم کا مسلک (۱)	پروفیسر خورشید عالم	صفحہ	۲۹
فروری	اسلام کا قانون طلاق	الطاف احمد اعظمی	〃	۲۹
〃	مسجد اور عورت امام ابن حزم کا مسلک (۲)	پروفیسر خورشید عالم	〃	۴۹
مئی	چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن'' (۱)	〃	〃	۳۷
جون	چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن'' (۲)	〃	〃	۲۹
〃	سید احمد شہید کی تحریک جہاد کی ناکامی	الطاف احمد اعظمی	〃	۴۰

اگست	چہرے کا پردہ اور "حکمت قرآن" (۳)	پروفیسر خورشید عالم	صفحہ	۳۷
ستمبر	چہرے کا پردہ اور "حکمت قرآن" (۴)	〃	〃	۳۹
〃	صبح کل آئے گی	راشد شاز	〃	۶۲
اکتوبر	چہرے کا پردہ اور "حکمت قرآن" (۵)	پروفیسر خورشید عالم	〃	۳۷
نومبر	سی پی ایس انٹرنیشنل ـــــ کسی نئے فتنے کی تمہید؟	عمار خان ناصر	〃	۲۵
〃	چہرے کا پردہ اور "حکمت قرآن" (۶)	پروفیسر خورشید عالم	〃	۲۹
دسمبر	طٰہٰ حسین اور ادب جاہلی	محمد وسیم اختر مفتی	〃	۲۹
〃	چہرے کا پردہ اور "حکمت قرآن" (۷)	پروفیسر خورشید عالم	〃	۴۰

نقد و نظر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مارچ	"اسلام اور موسیقی" ـــ "الاعتصام" کی تنقید پر تبصرہ (۱)	منظور الحسن	صفحہ	۲۴
اپریل	"اسلام اور موسیقی" ـــ "الاعتصام" کی تنقید پر تبصرہ (۲)	〃	〃	۳۱
〃	غناء جاریتین کے واقعہ میں راویوں کے تصرفات	محمد عمار خان ناصر	〃	۵۹
جولائی	انجیل کی زبان؛ ایک ناقدانہ جائزہ	محمد اسلم صدیق	〃	۲۳
〃	انجیل کی زبان؛ یونانی یا سریانی	عبد الستار غوری	〃	۳۱
ستمبر	غناء جاریتین کے واقعہ میں راویوں کے تصرفات	محمد عمار خان ناصر	〃	۲۷
	"الاعتصام" کی تنقید کا جائزہ			

سیر و سوانح

جنوری	مرکز توحید کی تعمیر اور دعاے ابراہیم	خالد مسعود	صفحہ	۳۷
〃	سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا	محمد وسیم اختر مفتی	〃	۴۹
فروری	بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر (۱)	خالد مسعود	〃	۵۷
〃	ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۱)	محمد وسیم اختر مفتی	〃	۶۴
مارچ	بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر (۲)	خالد مسعود	〃	۶۳

اپریل	ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ (۲)	محمد وسیم اختر مفتی	صفحہ	۶۵
مئی	ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ (۳)	محمد وسیم اختر مفتی	؍؍	۴۷
جون	بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر (۳)	خالد مسعود	؍؍	۵۱
؍؍	ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ (۴)	محمد وسیم اختر مفتی	؍؍	۵۸
اگست	ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ (۵)	؍؍ ؍؍	؍؍	۶۱
اکتوبر	ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ (۶)	؍؍ ؍؍	؍؍	۵۷
نومبر	بنی اسماعیل کی تولیت بیت اللہ	خالد مسعود	؍؍	۵۱
؍؍	عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۱)	محمد وسیم اختر مفتی	؍؍	۶۰
دسمبر	نبی موعود کی آمد (۱)	خالد مسعود	؍؍	۴۹
؍؍	عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۲)	محمد وسیم اختر مفتی	؍؍	۵۷

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یسئلون

جنوری	متفرق سوالات	جاوید احمد غامدی/معظم صفدر	صفحہ	۶۵
مارچ	متفرق سوالات	؍؍ ؍؍	؍؍	۶۷
مئی	متفرق سوالات	؍؍ ؍؍	؍؍	۵۵
جون	متفرق سوالات	؍؍ ؍؍	؍؍	۶۷

وفیات

اپریل	مولانا سید اسعد مدنی	مولانا زاہد الراشدی	صفحہ	۶۹
مئی	مولانا سید وصی مظہر ندوی	محمد اسحٰق	؍؍	۶۱

اشاریہ

دسمبر	اشاریہ ''اشراق'' ۲۰۰۶ء	نعیم احمد	صفحہ	۶۳